سوانح عمری

۱۲۰

حالات نواب دبیر الدولہ

یعنی

نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خان بہادر

مصلح جنگ وزیر اعظم ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی

بادشاہ دہلی کے مختصر سوانحات عمر

مع

مختصر حالات دخترش عزیز النساء بیگم یعنی والدہ [illegible]

آنریبل ڈاکٹر سید احمد خان بہادر ایل ایل ڈی کے

سی ایس آئی - بانی علیگڈھ کالج

مرتبہ مؤلفہ محمد الدین فوق ایڈیٹر کشمیری میگزین لاہور

۱۹۱۲ء مطابق محرم الحرام سنہ ۱۳۳۰ھ موافق ماگھ سمت ۱۹۶۸ ب

دیباچہ

سنہ ۱۹۱۰ء کے کشمیری میگزین میں اب فخر مسلمانان ہند سر سید احمد خاں بہادر کی والدہ عزیز النساء بیگم دختر بلند اختر نواب دبیر الدولہ خواجہ فخر الدین احمد وزیر بادشاہ دہلی کے مختصر حالات لکھے گئے۔ میں نے وعدہ کیا تھا۔ کہ نواب دبیر الدولہ کے حالات بھی جب مہیا اور دستیاب ہونگے تو انذ ناظرین کئے جائینگے۔

سنہ ۱۹۱۱ء کے ایام گرما بسر کرنے کے لئے ۲۴ جولائی کو میں کشمیر پہنچا۔ وہاں مطالعہ اور لکھنے پڑھنے کے لئے کافی وقت تھا۔ اس لئے ۱۳ اگست کو نواب دبیر الدولہ کے حالات لکھنے شروع کئے۔ جو ۹ ستمبر تک مکمل ہو گئے۔ نواب دبیر الدولہ کے حالات میں سب سے زیادہ امداد سیرت فریدیہ سے لی گئی ہے۔ جو ان کے نواسے یعنی سید احمد خاں بہادر نے خود لکھی ہے۔ اس کے علاوہ بزم آخر مؤلفہ مولوی سید احمد دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ۔ وسوانحات راجہ رام موہن رائے تاریخ ہند مولفہ خان بہادر مولوی محمد ذکا اللہ صاحب۔ حیات جاوید مصنفہ شمس العلما حالی صاحب۔ اور بعض اور کتب سے بھی استفادہ حاصل کیا گیا ہے

عزیز النساء بیگم جن کی تعلیم وتربیت سے سید احمد ریفارمر قوم اور سر سید احمد خاں بہادر کہلائے چونکہ کشمیری الاصل تھیں۔ اسلئے کتاب کے آخر میں ان کے حالات بھی لکھدیئے گئے ہیں۔

۹ ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء کو وڈ مقام
متصل رام پور راجپور کشمیر

محمد الدین فوق

۶۶۶۹ء

حالات نواب دبیرالدولہ

خواجہ فریدالدین احمد خان بہادر

آباؤاجداد جب تک شاہان مغلیہ عروج پر رہے اور اُن کی آمدرفت کشمیر میں جاری رہی کشمیری تجارت بھی حد کمال تک پہنچی ہوئی تھی۔ بادشاہ بہ نفس نفیس ہزاروں اور لاکھوں کا مال خریدتے تھے وزیر امیر اور عام لوگ جو اُن کے ساتھ آتے تھے۔ تحفہ تحائف کے طور پر وہ بھی سینکڑوں اور ہزاروں روپیوں کا مال خرید لیتے تھے۔ جب طوائف الملوکی کا زور ہوا اور اورنگ زیب عالمگیر کے بعد رہی سہی شان وشوکت بھی خاک میں مل گئی۔ تو کشمیر کی سیر کس کو سوجھتی تھی۔ سب لوگ بلکہ خود بادشاہ تک جس حال میں تھے۔ اسی کو غنیمت اور بہتر سمجھتے تھے۔ مغلیہ حکومت کے زوال کے ساتھ ہی کشمیری تجارت کا بھی زور ٹوٹ گیا۔ تاجر اور سوداگر اب خود کشمیر سے باہر نکلنے لگے اور لکھنؤ اور دہلی اور دیگر شاہی مقامات میں قسمت آزمائی کے لئے روانہ ہوئے انہیں لوگوں میں خواجہ عبدالعزیز بھائی اور انکے فرزند خواجہ اشرف بھی تھے۔ جو بہت سا مال لیکر اس خزاں رسیدہ شہر میں داخل ہوئے۔ جہاں اسلامی حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اور مغلیہ خاندان جسکی سطوت وہیبت نے چار دانگ عالم میں شہرت پیدا کرلی تھی۔ آخری سانس لے رہا تھا۔ خواجہ عبدالعزیز بہت سی امیدیں اور توقعات لیکر وطن سے نکلے۔ اور حق یہ ہے کہ کسی ایسی نیک ساعت میں نکلے۔ کہ مرفع الحالی اور فراغدستی قدم قدم پر نثار ہو رہی تھی۔ خواجہ عبدالعزیز گو ترک وطن کی غرض سے دہلی نہیں آئے تھے لیکن اُن کی عقلمندی۔ تجربہ کاری اور حسن اخلاق نے اس قدر اُن کے ہواخواہ پیدا کر دیئے اور اُن کی تجارت یہاں اس قدر چمک گئی۔ کہ آخر انہوں نے دہلی ہی کو اپنا وطن قرار دے لیا۔

دہلی میں ایک اور کشمیری خاندان

دہلی میں یوں تو بیسیوں اور سینکڑوں خاندان مشہور ہیں جو آکر آباد ہوئے اور اب تک موجود ہیں۔ مگر خواجہ عبدالعزیز عہد فی کے کسی قریبی زمانہ میں جو مشہور خاندان کشمیر سے دہلی میں آیا۔ وہ خواجہ عبید اللہ احرار کی اولاد سے تھا۔ اس خاندان نے بھی زوال سلطنت مغلیہ میں کمال عروج حاصل کیا۔ شاہان مغلیہ کے زمانہ میں چار عہدے خصوصیت سے قابل ذکر تھے۔ ایک عہدہ جس کا کام یہ ہوتا تھا۔ کہ درباری علماء اس کے ذریعہ دربار میں پیش ہوا کرتے تھے۔ اور ان لوگوں کو جس قدر انعام واکرام ملا کرتا تھا۔ وہ سب ملک العلماء کے توسط ہی سے ملا کرتا تھا۔ دوسرا عہدہ ملک الحکماء تھا۔ جو طبیبوں اور حکیموں کو دربار شاہی میں پیش کیا کرتے تھے۔ تیسرے عہدہ کا نام ملک الشعراء تھا۔ جو درباری شاعروں اور مستحق اور امیدوار شعرا کو بادشاہ کے حضور میں پہنچایا کرتا تھا۔ چوتھے عہدہ کا نام نقیب الاولیا تھا جو سب عہدوں سے بڑا اور سب سے زیادہ ذمہ داری کا عہدہ تھا۔ اس جلیل القدر عہدہ پر خواجہ عبید اللہ احرار کی اولاد سے خواجہ محمد مراد احراری کشمیری سرفراز تھے۔ جن کے ذریعے درویش اور مشائخ اور اہل اللہ بزرگ بادشاہ تک رسائی کر سکتے تھے۔ تمام درگاہوں کی معافیات اور عرس اور فاتحہ وغیرہ کے اخراجات کا حساب نقیب الاولیا کی تحویل ہی میں تھا۔

خواجہ فریدالدین احمد کی پیدائش

خواجہ عبدالعزیز کے بیٹے خواجہ اشرف نے بھی دہلی میں اچھا رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ اور کاروبار کو خاصی رونق دے رکھی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اولاد سے بھی مالا مال کر دیا تھا۔ یعنی آپ کے آٹھ فرزند تھے۔ اور سب این خانہ تمام آفتاب کی مثال تھے۔

جس زمانہ سے عنوان ہذا کو تعلق ہے یہ وہ زمانہ تھا۔ جبکہ نادر شاہ ایرانی شاہجہان کی قیمتی اور مرصع یادگار تخت طاؤس اور کئی کروڑ روپیہ دہلی سے لوٹ کر لے گیا تھا۔ یہ وہ دردناک زمانہ تھا۔ جبکہ محمد شاہ کو نہ صرف ایک باقبال گذریئے سے شکست ہی کھانی پڑی تھی بلکہ اس کے بیٹے کو اپنی پیاری بیٹی بھی دینی پڑی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دہلی کے لوگ نادر شاہ کا نام سنکر کانپ اٹھتے تھے۔ اور مظلوم اور آفت رسیدہ لوگ ایرانیوں

کو رات دن کو سا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دہلی کے قتل عام کی ہولناک یاد دلوں سے محو ہو رہی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ رام رنگی (شراب) کا رنگیلا (محمد شاہ) عاشق اپنے عہد حکومت کے آخری سال کی تیاریوں میں تھا۔ اور اپنے فرزند احمد شاہ کے لئے دہلی کا تخت و تاج خالی کر رہا تھا۔ ٹھیک اسی زمانہ میں جبکہ ہجری سن ۱۱۶۱ھ اور مسیحی سن ۱۷۴۷ء تھا۔ خواجہ اشرف کے ہاں بمقام دہلی خواجہ فریدالدین احمد پیدا ہوئے۔

خواجہ فریدالدین احمد کے دوسرے بھائی

خواجہ فریدالدین احمد کے سات اور بھائی تھے۔ جن کے نام یہ ہیں۔ خواجہ کمال الدین خواجہ حسام الدین۔ خواجہ محی الدین۔ خواجہ نورالدین۔ خواجہ شہاب الدین خواجہ علاؤ الدین۔ اور نجیب الدین۔ ان میں سے آخری دو نہایت مشہور اور نامور گذرے ہیں۔ اسلئے انکا کچھ تھوڑا سا حال لکھا جاتا ہے۔

خواجہ علاءالدین یہ خاندان کشمیر آنے سے پہلے ہمدان سے نسبت وطن رکھتا تھا۔ اور صوفیا کے سلسلہ میں مشہور تھا۔ چنانچہ خواجہ یوسف ہمدانی اسی خاندان کے ایک بہت بڑے بزرگ تھے۔ کشمیر آنے پر دنیاوی اغراض میں یہ خاندان ملوث ہو گیا۔ لیکن کشمیر میں اسلام کی ابتدا جن مبارک ہاتھوں سے ہوئی تھی۔ وہ ہاتھ دنیاوی تفکرات سے بے تعلق اور ذاتی اغراض سے منزہ و پاک تھے۔ اور یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دین حقہ کی اشاعت کی خاطر نہ جان کی پرواہ کی۔ نہ مال کی اور نہ فرزند کی۔

یہ لوگ مسلمانوں کے اصلی لیڈر تھے۔ اصلی رہنما اور حقیقی پیشوا تھے۔ اور در حقیقت ایسے ہی لوگوں پر مصلح قوم اور پیر و مرشد کا مبارک نام عاید ہو سکتا ہے۔ کشمیر میں اسلام کی ابتدا چونکہ فرقہ صوفیا کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔ اس لئے پیری مریدی کا سلسلہ اس سرزمین میں نہایت مضبوطی سے قائم ہوا۔ اور جس کا زور شور آجتک بدستور جاری ہے۔ خواجہ عبدالعزیز ہر چند کشمیر سے پنجاب آ بیٹھے۔ گو مسند پذیر ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ خاندانی اور کچھ کشمیر کی رہائش کے باعث درویشی و فقیری اور پیری و مریدی کا جو مذاق طبیعت میں تھا وہ پنجاب میں بھی بدستور جاری رہا۔ یعنی آپ ہمیشہ اہل صوفیا اور بزرگان دین کے خدمتگذار رہے۔ یہ مذاق آپ کی اولاد کو بھی ورثہ میں ملا۔ آپ کے پوتے خواجہ علاءالدین نے شاہ محمد آفاق صاحب کی بیعت کی اور طریقہ نقشبندیہ میں قدم رکھا۔ آپ نے حج بیت اللہ اور زیارت

مدینہ منورہ بھی کی۔ لوگوں سے بہت کم ملتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر و اذکار میں اپنی ساری عمر گذار دی۔ غدر سے دو سال پہلے ۱۸۵۵ء مطابق ۱۲۷۲ھ میں جمادی الاول کی بیس تاریخ کو انتقال فرمایا۔ آپ کے تین بیٹے تھے۔ جن میں سے ایک (خواجہ ضیاء الدین صاحب) مشہور واعظ تھے۔

خواجہ نجیب الدین یہ وہ بزرگ تھے۔ جو اپنے تمام بھائیوں میں سب سے زیادہ مشہور ہوئے۔ اور جن کو ہزاروں آدمیوں نے سجدہ کیا۔ اور معبود اللہ کہا[1]۔ آپ ابتدائے عمر ہی سے دنیاداروں سے الگ رہا کرتے تھے۔ اور ان کی ملاقاتوں سے سخت گھبرایا کرتے تھے۔ آپ نے فقیری بھی اختیار کی۔ تو اس قسم کی جو بالکل "ننگ دھڑنگ" تھی۔ اور جس سے دنیاپرست عموماً نفرت کیا کرتے تھے۔ آپ نے درویشی اختیار کر کے طریقہ رسول شاہی اختیار کیا۔ جو سہروردی خاندان کے ایک بزرگ رسول شاہ جی کے پیروؤں نے قائم کیا تھا۔ خواجہ نجیب الدین کے مرشد کا نام مولوی محمد حنیف تھا۔ مولوی محمد حنیف نے اپنے اخلاص مند مرید کا نام شاہ فداحسین رکھا اور آخر عمر تک آپ اسی نام سے مشہور ہے۔ شاہ فداحسین نے فقہ تفسیر اور علم تصوف کی تمام کتابیں اپنے پیر سے پڑھیں۔ اور ان میں کافی عبور حاصل کر لیا۔ جب مولوی صاحب نے دیکھا کہ شاہ فداحسین اب فقیر کامل اور درویش مکمل ہو گئے ہیں۔ تو حکم دیا کہ کل کتابیں کنوئیں میں پھینک دو۔ شاہ فداحسین نے فوراً اس پر عمل کیا اور جسقدر کتبخانہ موجود تھا۔ سب اکٹھا کر کے ایک گہرے کنوئیں میں پھینک دیا۔ پھر پیر نے حکم دیا کہ رسول شاہی طریق عملی طور پر اختیار کرو۔ یعنی داڑھی اور مونچھوں کا صفایا بول دو۔ بدن پر بھبوت مل لو۔ اور جسم پر سوائے لنگوٹی کے کوئی کپڑا نہ رکھو۔ آپ نے ان ہدایات پر بھی پورا عمل کیا۔ اور پیر و مرشد کے حکم سے سرتابی نہ کی۔ لنگوٹی باندھے اور بدن پر بھبوت ملے سارا دن بیٹھے رہتے تھے۔ جب کبھی باہر نکلتے تو گھٹنوں کو تہبند سے لپیٹ لیتے اور سر پر ایک مثلث نما رومال باندھ لیا کرتے تھے۔ آپ نے ۱۸۴۳ء مطابق ۱۲۵۹ھ میں محرم کی اٹھارھویں کو الور میں انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار بمقام الور رسول شاہیوں کے تکیہ میں مرجع خاص و عام ہے

---

[1] سیرت فریدیہ مولفہ آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں مغفور

خواجہ فرید الدین احمد کی تعلیم

خواجہ فرید الدین احمد دنیاوی لحاظ سے اپنے سب بھائیوں بلکہ اپنے سب خاندان سے زیادہ باقبال نکلے - ابتدا ہی میں اُن کو تحصیل علم کا بہت شوق تھا - اور جب درس و تدریس میں اُن کی طبیعت کھلی - اور جماعت میں کچھ چل نکلے - تو اُستاد کو معلوم ہوا کہ یہ لڑکا ریاضی کے لئے خاص دماغ لیکر آیا ہے - دہلی میں آپ نے درسی کتابوں سے فراغت حاصل کرلی - علم ریاضی میں وہ نام پیدا کیا - کہ دہلی میں اُن کا کوئی ثانی نظر نہ آتا تھا -

یہ وہ زمانہ تھا - جب دہلی میں بدنصیب شاہ عالم ثانی برائے نام حکومت کر رہا تھا اور اقبال ہند قومیں دہلی کے گردو پیش مغلیہ حکومت کا چراغ بجھانے کیلئے بادصرصر کا کام دے رہی تھیں - چونکہ سلطنت کمزور ہو رہی تھی - اور دہلی میں اہل علم و فن ناقدردانی اور کس مپرسی کے ہاتھوں پامال ہو رہے تھے - اس لئے سر چھپانے کے لئے اب صرف لکھنؤ ہی تھا - جہاں شاہان دہلی کے وزیروں کا خاندان آسمان عروج پر روشن ستارہ کی طرح چمک رہا تھا - شعرا - علما - فضلا اور تمام اہل پیشہ لکھنؤ میں جمع ہو گئے تھے - اور شاہان اودھ کی قدردانیوں اور علم دوستیوں سے دامن مراد بھر رہے تھے - انہیں لوگوں میں ایک بزرگ تفضل حسین خاں[1] بھی تھے - جن کو علامہ کا خطاب ملا ہوا تھا - علامہ تفضل حسین تمام علوم دینی و دنیوی میں ماہر کامل تھے - اور علوم ریاضیہ میں تو ان کی وہ شہرت تھی کہ اپنے عہد کے لاثانی اور عالم یکتا تصور کئے جاتے تھے - خواجہ فرید الدین کو ایک ایسے ہی اوستاد کامل کی تلاش تھی - اور ہر چند کہ عمر ۳۲ سال کے

---

[1] علامہ تفضل حسین خاں ابتدا میں جنرل پامر کے پاس بعہدہ منشی رہے - اُن دنوں سفارت کلکتہ کے لئے نواب آصف الدولہ کو ایک زیرک اور قابل آدمی کی ضرورت تھی - جنرل پامر نے علامہ کی سفارش کی - نواب ممدوح نے اُن کو اپنا سفیر بنا کر کلکتہ بھیجا - اور جب وہاں سے واپس آئے تو عہدہ نیابت بھی اُن کو دیا گیا - نواب سعادت علی خاں نے بھی آپ کو سفیر مقرر کر کے کلکتہ بھیجا - لیکن جب سنہ سفارت کے پہنچنے میں دیر ہوئی تو آپ شائستہ سے واپس روانہ ہو گئے اور راستہ ہی میں بمقام سرزاری باغ ۱۷۹۹ء میں انتقال فرما گئے (سیرت فریدیہ)

قریب تھی۔ لیکن علم ریاضی کا شوق کسی درسی طالب علم سے کم نہ تھا۔ چنانچہ آپ علامہ تفضل حسین خاں لکھنوی کی خدمت میں تحصیل و تکمیل علوم کے لئے روانہ ہوئے۔

جس زمانہ میں خواجہ فریدالدین احمد لکھنؤ گئے ہیں۔ اُن دنوں نواب آصف الدولہ[1] کی حکومت عین شباب پر تھی۔ اور لکھنؤ کی جوانی پھٹی پڑتی تھی۔ علامہ مذکور آپ کے ذہن رسا اور آپ کی قابلیت دیکھکر حیران رہ گیا۔ علوم ریاضیہ میں جسقدر کتابیں خواجہ فریدالدین احمد کو مل سکیں۔ سب پر عبور حاصل کیا۔ اور دو تین سال تک لکھنؤ میں رہکر واپس آ گئے۔

خواجہ فریدالدین احمد کی شادی

خواجہ عبدالعزیز کا خاندان روز بروز ترقی حاصل کر رہا تھا۔ اور اب چونکہ دائمی سکونت دہلی ہی میں تھی۔ اس لئے رسوخ اور میل جول بھی بڑھ رہا تھا۔ خواجہ فریدالدین جوان بلکہ نوجوان ہو گئے تھے۔ اُن کے لئے رشتہ کی تلاش تھی۔ اور رشتے مل بھی سکتے تھے۔ لیکن خواجہ اشرف ایک ایسے رشتہ کی تلاش میں تھے۔ جو کشمیری ہو۔ اور نجیب الطرفین ہو۔ اور اُن کے مقابلہ کا ہو۔ آخر خواجہ محمد مراد احراری کشمیری نے جو بادشاہی دربار میں عہدہ نقیب الاولیا پر ممتاز تھے۔ اور خواجہ اشرف کے خاندان سے سلسلہ ارتباط بھی رکھتے تھے۔ تعلقات کو اور زیادہ مستحکم کرنے کے لئے سلسلہ جنبانی کی۔ خواجہ محمد احرار کو کیا عُذر تھا۔ وہ بھی ایک شریف کشمیری گھرانے کے خواہان تھے۔ آخر تھوڑے ہی دنوں کے بعد سنہ ۱۱۹۳ھ مطابق ۱۷۷۹ء میں خواجہ فریدالدین احمد کی شادی خواجہ محمد احرار کی بیٹی سے ہو گئی۔

خواجہ فریدالدین احمد دوبارہ لکھنؤ میں

---

[1] نواب آصف الدولہ ۲۵ ر ذیقعد ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۵ء میں تخت نشین ہوتے اور ۲۸ ر ربیع الاول ۱۲۱۲ھ مطابق ستمبر ۱۷۹۷ء میں انتقال کر گئے۔ نواب سعادت علی خاں نے تخت و تاج اودھ حاصل کیا۔ مؤلف

۱۷۹۷ء مطابق ۱۲۱۲ھ میں خواجہ فریدالدین احمد پھر لکھنؤ گئے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہوسکا۔ کہ وہاں کس غرض اور کس مقصد سے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نواب آصف الدولہ کے چراغ زیست کی کیفیت اُستاد کے اس شعر کے مطابق تھی ؎

اب داغ کا وہ حال ہے دم جیسے ہو باقی خورشید لب بام میں یا شمع سحر میں

یہاں تک کہ خواجہ فریدالدین کو لکھنؤ آئے ہوئے ابھی چند ہی روز ہوتے تھے کہ نواب آصف الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ اور نواب سعادت علی خاں تخت پر بیٹھ گیا۔ لکھنؤ میں خواجہ فریدالدین نے آلات ریاضی کے متعلق ایک رسالہ بنام خویدالافکار فی اعمال الفرجار لکھا۔ اور اُس کے دیباچہ میں بعض ایسے معاملات پر روشنی ڈالی جن سے کشمیری بلکہ ہندوستانی دماغ کی اعلےٰ قابلیت معلوم ہوتی ہے۔ وہ دیباچہ سیرت فریدیہ میں اصل عبارت فارسی میں درج ہے یہاں اُس کا ترجمہ لکھا جاتا ہے۔

فقیر (فریدالدین احمد) کو ایام طفولیت سے علم ریاضی کا کمال شوق تھا۔ اور کچھ اس سے حاصل بھی کیا۔ بعض حواشی میں یہ نظر سے گذرا۔ کہ آلات ریاضی میں سے ایک آلہ بنام پرکار تناسبہ تھا۔ کہ اُس سے ہندسے اور حساب کے اکثر مسائل آسانی سے حل ہو جاتے تھے۔ اور اُس آلہ کو بعض نجومی بھی استعمال میں لاتے تھے۔ لیکن آجکل وہ آلہ چونکہ بالکل نایاب ہے۔ اس لئے اُس کا علم و عمل بھی مفقود ہے۔ چونکہ اکثر اُستادوں سے بھی اس آلہ کا نام سُنا تھا۔ اسلئے اس کے دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ اور جس کسی ریاضی دان سے اس آلہ سے متعلق تذکرہ ہوتا تھا وہ یہی کہتا تھا۔ کہ ہم نے ایسی پرکار جس کا تم ذکر کرتے ہو نہ دیکھی ہے نہ سُنی ہے۔ ۱۲۱۳ھ میں یہ فقیر لکھنؤ گیا۔ وہاں جنرل مارٹن اور مسٹر گوراوزلی سے ملاقات ہوئی۔ اُن کے پاس ایک عجیب و غریب آلہ دیکھا۔ کہ کیل کانٹوں سے اور دو نوکدار اور لمبی چونچوں سے مرکب تھا۔ اُس کی کمر میں ایک میخ مقراض کی طرح تھی۔ لیکن یہ میخ اپنی جگہ سے ہلانے سے حرکت کرتی تھی۔ اور خط کھینچتی تھی۔ میں نے ایسا آلہ اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ صاحبان عالیشان نے کہا۔ کہ اس آلہ کا نام پرکار ہے۔ اور اس سے خطوط اور دایرُوں میں آسانی ہوتی ہے۔

اور انہوں نے کئی عمل اس آلہ سے مجھے کر کے دکھائے۔ میں وہ آلہ جنرل مارٹن سے عاریتاً لیکر اپنے مکان پر آیا۔ کئی دنوں تک اس غور و فکر میں رہا کہ اس کے ساتھ کا ایک آلہ میں بھی ایجاد کروں۔ اور جو مشکلات بعض حسابی و نجومی مسائل میں پیش آتی ہیں۔ اُن کو رفع کروں۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ مگر باوجود ناکامیوں کے میں نے ہمت نہ ہاری۔ اور اس میں لگا رہا۔ آخر میں نے بالکل اسی شکل کا ایک چاندی کا آلہ تیار کرلیا مسٹر اوزلی نے میری بہت تعریف کی۔ اور وہ آلہ مجھ سے لیکر نواب وزیر سعادت علی خاں بہادر والئے اودھ کی خدمت میں پیش کیا۔ جنہوں نے اسکو نہایت پسند کیا اور کہا ما بدولت نے صرف نام سُنا ہوا تھا۔ کہ پرکار متناسبہ کوئی چیز ہے۔ لیکن ابھی تک اُس کو دیکھا نہیں تھا۔ خواجہ صاحب اس سے آگے لکھتے ہیں کہ بادشاہ نے اس پرکار سے میرے سامنے تقسیم خط اور استخراج وتر وغیرہ کا عمل کیا اور کہا کہ سُنا ہے یہ آلہ اعمال نجوم کے متعلق بھی کام آتا ہے۔ لیکن اُس طریق سے نہ میں اور نہ صاحبان انگریز جو میرے دربار میں ہیں آگاہ ہیں۔ پھر لکھتے ہیں اسی نمونے پر میں نے برنجی آلے بھی تیار کئے۔ جن پر ہندسے بجائے انگریزی حروف کے فارسی حروف میں لکھے گئے۔ پھر میں کلکتہ گیا۔ وہاں سے کئی پرکاریں خریدیں۔ اور نجوم اور علم ہندسہ کے متعلق میں نے وہاں اس قدر عمل اور تجربے کئے۔ کہ مجھے یقین ہوگیا۔ کہ پرکار متناسبہ جس کا نام اکثر کتب ریاضی میں موجود ہے یہی ہے یہی پرکار سابق میں عرب و عجم میں مروّج تھی۔ اور یہی پرکار اب یوروپ میں جاری ہے میرے اس یقین کی اکثر صاحبان انگریز نے بھی تصدیق کی۔

خواجہ فریدالدین احمد انگریزی ملازمت میں

جس زمانہ میں خواجہ فرید دوبارہ لکھنؤ گئے اور وہاں اُنہوں نے حکومت کی تبدیلی دیکھی اُس وقت دہلی میں شاہ عالم پادشاہ کی حکومت تھی۔ اور کلکتہ میں ہندوستان کی گورنر جنرلی پر مارکوئیس آف ولزلی متمکن تھے۔ جو انگریزی حکومت کو نہایت آہستگی خاموشی مگر صلح و امن کے ساتھ ترقی و وسعت دے رہے تھے۔ کلکتہ میں اعلےٰ افسران انگریزی کے مشورہ سے ایک مدرسہ بنام مدرسہ کلکتہ قائم کیا گیا تھا۔ اُس میں

سپرنٹنڈنٹی کی جگہ خالی تھی۔ حکام انگریزی کو ایک قابل تریں دیسی کی تلاش تھی۔
لکھنؤ میں بھی اُن دنوں اکثر انگریز تھے۔ اُن میں سے قریباً سب نے خواجہ فریدالدین احمد
کے لئے سفارشی خطوط لکھے۔ اور آخر خواجہ فرید سات سو روپیہ ماہوار پر سپرنٹنڈنٹ
مدرسہ کلکتہ ہوگئے۔ تحصیل علم کے بعد یہ سب سے پہلی ملازمت تھی۔ جو خواجہ فرید کو اُس
سرکار ابد قرار نے پیش کی۔ جس کا استحکام و اقبال مغلیہ حکومت کی کمزوری اور اُسکے
زوال کے پردہ میں آرہا تھا۔ خواجہ صاحب کے کلکتہ جانیکا ذکر اُنکی کتاب کے دیباچہ
کے ترجمہ میں سطور بالا میں لکھا جاچکا ہے۔

خواجہ فریدالدین احمد سفارت ایران پر

شاہ عالم کے زمانہ میں ہندوستان کی شہنشاہی تو خواب وخیال ہوگئی تھی۔
البتہ دہلی کی بادشاہی قایم تھی۔ اور اُس کی حدود بھی کچھ زیادہ دور تک نہ تھیں۔
ہر طاقتور جاگیردار اور ہر باقبال عہدہ دار اپنی شوکت وحکومت بڑھاکر اپنی ریاست
الگ قایم کر رہا تھا۔ زمان شاہ کابلی نے بھی نادرشاہ اور احمد شاہ کی دیکھا دیکھی ہندوستان
پر حملہ کرنے اور اس کو اپنے زیر حکومت لانے کا عزم مصمم کیا۔ سرکار انگریزی جس کا
اقتدار بڑھتی دولت کی طرح ترقی پر تھا۔ ایک ایسے زبردست حریف کو کس طرح
تخت گاہ سلاطین تیموریہ میں حکومت کرتے دیکھ سکتی تھی۔ چنانچہ سرکار انگریزی
نے زمان شاہ کے حملہ کو روکنے کے لئے ادھر اُدھر نامہ وپیغام شروع کئے۔ ایک
طرف تو زمان شاہ کے بھائیوں محمود شاہ اور فیروز شاہ کو افغانستان پر حملہ کرنے
کے لئے آمادہ کیا۔ اور دوسری طرف فتح علیشاہ والئے ایران کی خدمت میں
کپتان مالکم کو بطور سفیر بھیجا گیا۔ جنہوں نے ۲۸ جنوری ۱۸۰۱ء کو ایک عہدنامہ اپنے
اور حاجی ابراہیم خاں وزیر ایران کے دستخطوں سے مکمل کیا۔ اور شاہ ایران کی طرف
سے حاجی محمد خلیل خاں سفیر ایران مقرر ہوکر ۲۲ مئی ۱۸۰۲ء کو بمبئی پہنچے۔ بظاہر
دولت ایران اور دولت انگلشیہ کے تعلقات اب نہایت اچھے تھے۔ لیکن ۲۰
جولائی کو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جس سے نہ صرف تعلقات فی مابین کے
ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا بلکہ جنگ کی نوبت پہنچنے والی تھی۔ اس واقعہ

کی تفصیل یہ ہے۔ کہ ایک دن سفیر ایران کے ہمراہیوں اور اُن کی محافظ انگریزی کمپنی کے آدمیوں میں کسی بات پر تکرار ہو گئی۔ اور نوبت تیر تلوار تک پہنچی۔ سفیر ایران کو خبر ہوئی وہ معاملہ رفع کرنے کے لئے باہر نکلے۔ اور اتفاقاً کسی انگریزی سپاہی کی گولی سے مارے گئے۔ لارڈ ولزلی گورنر جنرل نے اس واقعہ پر سرکاری طور پر افسوس ظاہر کیا۔ اور شاہ ایران کے پاس اظہار افسوس کے لئے دو آدمی بھیجے جانے تجویز ہوئے۔

سرکار انگریزی نے قابل دیسی آدمیوں پر نظر دوڑائی۔ تاکہ سفارت کی تقویت کے لئے کسی کو منتخب کیا جا سکے۔ لیکن خواجہ فریدالدین احمد کے سوائے اس اہم ذمہ داری کے قابل کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ آخر ۱۸۰۳ء کے کم و بیش جب کہ دہلی کے پولیٹکل مطلع پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور انگریزی پرچم حدود دہلی میں زور شور سے لہرا رہا تھا۔ خواجہ فریدالدین احمد مسٹر لوٹ کی معیت میں ایران روانہ ہوئے۔

خواجہ فریدالدین احمد ایران میں

سیرت فریدیہ میں آنریبل ڈاکٹر سید احمد خاں لکھتے ہیں۔ کہ میں نے خواجہ فریدالدین احمد کے روزنامچہ[1] میں لکھا دیکھا تھا کہ" مسٹر لوٹ بیمار ہو گئے۔ اور گورنر جنرل کے حکم سے خواجہ فریدالدین احمد بطور سفیر مستقل کے روانہ ہوئے"۔

شاہ ایران کے دربار میں خواجہ فریدالدین احمد نہائیت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ اور جب ایران میں اُن کے علم و فضل کا چرچا لوگوں کو معلوم ہوا۔ تو علمائے ایران جوق جوق اُن کے پاس آنے لگے۔ شاہزادگان و امرایان ملک سے خوب رسوخ پیدا کیا۔ اور اس رسوخ کے ذریعہ سفارت کے مقاصد بہت خوبی سے انجام دیئے۔ خصوصاً شاہزادہ حسین علی مرزا۔ صادق علی خاں اور چراغ علی خان ... سے جو دربار شاہی میں سب سے بڑا اقتدار رکھتے تھے۔ نہائیت

[1] خواجہ فریدالدین احمد کا دستور تھا۔ کہ عہد شباب کے بعد سے وہ بدستور اپنا روزنامچہ لکھا کرتے تھے۔ اس میں شہر بشہر شیراز طہران کے علاوہ دہلی لکھنؤ کلکتہ کے عجیب و غریب حالات تھے۔ افسوس غدر ۱۸۵۷ء میں یہ روزنامچہ تلف ہو گیا۔

دوستی پیدا کرلی تھی۔

اس سفارت کا بڑا مقصد یہ تھا۔ کہ ایک تو حاجی محمد خلیل خاں کی موت کا واقعہ بالکل اتفاقی امر تھا۔ جس پر گورنمنٹ انگریزی کو کمال افسوس ہے۔ اور دوسرے یہ کہ حاجی محمد خلیل خاں کی جگہ دولت علیۂ ایران ایک اور سفیر کا بھیجنا منظور فرمائے تاکہ دونوں سلطنتوں کے ارتباط باہمی کو سابق کی طرح استواری اور استقامت رہے

خواجہ فرید کی یہ پہلی پولیٹکل خدمت تھی۔ اس سے پہلے وہ پولیٹکل کاموں سے مطلق لاعلم تھے۔ لیکن اس اہم ترین خدمت کو انہوں نے اس خوبی سے نباہا کہ شاہ ایران سفیر انگریزی کی خدمات سے کمال محظوظ ہوا۔ اور نہ صرف سفیر مرحوم کے واقعۂ قتل ہی کو رفع دفع کر دیا۔ بلکہ دوسرا سفیر ہندوستان میں بھیجنا تجویز کیا گیا۔ جس کے لئے محمد نبی خاں نامزد کئے گئے۔

سفیر شاہ ایران اور خواجہ فرید الدین احمد

محمد نبی خاں کی خواجہ فرید سے سفارت ہند پر متعین ہونے سے پہلے ہی دوستی تھی۔ جب سفارت پر نامزد ہو گئے۔ تو دوستی و محبت کو اور بھی ترقی ہو گئی۔ محمد نبی خاں کو شعر گوئی کا بھی شوق تھا۔ خواجہ فرید سے انہوں نے اپنی محبت کا ثبوت ایک قطعہ میں دیا۔ جو اس وقت لکھا گیا تھا۔ جب خواجہ فرید امور سفارت طے کرنے کے بعد شیراز سے براہ بوشہر ہندوستان کو واپس آنے لگے وہ قطعہ یہ ہے[1]

مشفقا امشب چو زلف گلرخاں	خاطرِ جمعم پریشاں گشتہ است
حیرت افزائید مرا از خویشتن	گرچہ رو احوالم انیساں گشتہ است
خاکدانِ دہر راز آب و ہوا	آتشی گوئی فروزاں گشتہ است
برالم نہ از گلے خارے خلید	تا بگویم اینم از آں گشتہ است
ہم یک امشب بندہ را مسرور دار	دل ترا از جاں چہ خواہاں گشتہ است

[1] محمد نبی خاں کی سفارت ہندوستان کا مفصل حال تاریخ سفارت حاجی خلیل خاں و محمد نبی خاں مطبوعہ بمبئی میں درج ہے۔ یہ قطعہ الوداعی بھی اسی تاریخ میں صفحہ ۱۰۳ پر درج ہے (سیرت فریدیہ)

ہجر تو بس مشکل آید بر سفیر   از چہ رو پیش تو آسان گشتہ است

خواجہ فرید الدین احمد برہما میں

خواجہ فرید بوشہر سے سیدھے کلکتہ آئے۔ جہاں گورنر جنرل کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ صاحب گورنر جنرل خواجہ فرید کی اس پولیٹکل خدمت سے بہت خوش ہوئے۔ انہیں دنوں گورنمنٹ انگریزی اور رئیس آوا واقع برہما میں چند پولیٹکل امور تصفیہ طلب تھے۔ گورنمنٹ نے ان معاملات کے طے کرنے کے لئے خواجہ فرید الدین احمد کا انتخاب کیا۔ اور خواجہ صاحب بطور ایجنٹ مقرر ہو کر آوا میں گئے۔ اور وہاں مفوضہ خدمت کو اس خوبی اور اس سرعت سے انجام دیا کہ فریقین یعنی سلطنت آوا اور سلطنت انگلشیہ دونوں نے اپنی خوشنودی ظاہر کی۔

خواجہ فرید الدین احمد بندھیل کھنڈ میں

خواجہ فرید کو آوا سے کلکتہ میں آئے۔ ابھی بہت تھوڑا عرصہ گذرا تھا۔ کہ سرکار انگریزی کو بندھیل کھنڈ کا ملک فتح کرنے کے بعد وہاں اپنا انتظام کرنا پڑا ابتداء عملداری میں مالگذاری کی وصولی کے لئے سخت دقتیں تھیں۔ سرکار انگریزی نے کچھ عرصہ تک سابقہ انتظام ہی قایم رکھا۔ اور جو پہلے تحصیلدار تھے۔ اُن کو برقرار رہنے دیا۔ تحصیلداری اُس زمانہ میں نہایت جلیل القدر اور ذی اختیار عہدہ تھا۔ تحصیلداروں کو تنخواہ نہیں ملا کرتی تھی۔ بلکہ ملک کا کچھ حصہ سپرد ہو جاتا تھا۔ اُس میں سے دس فی صدی بطور حق التحصیل تحصیلداروں کو ملا کرتا تھا۔ اس ذریعہ سے آمدنی ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ اور اختیارات کامل استعمال کئے جاتے تھے۔ آوا سے واپس آنے پر سرکار انگریزی نے خواجہ فرید الدین احمد کو بندھیل کھنڈ میں عہدہ تحصیلداری پر مقرر کیا۔ اور پرگنات اوگاسی وغیرہ (حدود باندہ) اُن کے سپرد کئے گئے۔ جب سرکار انگلشیہ نے بندھیل کھنڈ میں مضبوطی سے اپنے پاؤں جما لیے۔

تو پہلا انتظام منسوخ کر دیا۔ اور معمولی کلکٹر اور تحصیلدار مقرر کر دیئے جب اختیارات اور آمدنی میں ایک معقول حد تک کمی ہو گئی تو خواجہ فریدالدین احمد تیرہ چودہ برس کی انگریزی خدمات (از عہدہ سپرنٹنڈنٹ مدرسہ کلکتہ تا تحصیلداری) سے ۱۸۱۰ء میں مستعفی ہو کر دلّی چلے آئے۔

خواجہ فریدالدین احمد کی دلّی میں واپسی

خواجہ فریدالدین احمد ۱۷۹۷ء میں دوبارہ لکھنؤ گئے تھے۔ وہاں سے کلکتہ ایران آوا اور ضلع باندہ میں سرکار انگریزی کی سول اور پولیٹکل خدمات بجالاتے رہے۔ تیرہ چودہ سال کے بعد خواجہ فرید ۱۸۱۰ء مطابق ۱۲۲۵ھ میں جب واپس دہلی آئے۔ تو یہاں بہت انقلاب ہو چکے تھے۔ اور موافقت زمانہ اور اقبال ہمایونی یورپ کی با اقبال انگریزی قوم کے تصدق ہو رہا تھا۔

شاہ عالم کی آنکھوں کا نکالا جانا

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ خواجہ فریدالدین احمد دہلی سے تیرہ چودہ برس باہر رہے۔ اُن کے بعد دہلی میں جو سب سے بڑا واقعہ ہوا۔ اور جس نے سلطنت مغلیہ کی جڑیں اور بھی کھوکھلی کر دیں وہ بدنصیب شاہ عالم ثانی کا اندھا ہونا ہے۔ اس واقعہ کو عبرت انگیز واقعہ سمجھکر ذرا تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

عالمگیر ثانی کے بیٹے شاہ عالم ثانی کا واقعہ قیامت کے ہولناک واقعہ سے کم نہیں ہے۔ بادشاہ اور بیگمات کی بے عزتی و بے حرمتی ظالم غلام قادر روہیلہ کے ہاتھوں گو کئی دنوں سے شروع تھی۔ اور ہر چند کہ بوڑھی جوان اور معصوم اہل حرم اور ضعیف العمر بادشاہ اور کئی شاہزادے کئی دن سے جسمانی اور طرح طرح کی تکالیف میں مبتلا تھے۔ لیکن ۱۰ اگست ۱۷۸۸ء کی تاریخ خاندان تیموریہ اور ہندوستان کی اسلامی سلطنت میں نہائت عبرت ناک اور درد انگیز واقعہ کی یاد دلانے والی ہے۔ غلام قادر روہیلہ پٹھان نے جس کا نام نمک حراموں محسن کشوں اور شقی القلبوں کی فہرست میں چوٹی پر لکھنا چاہیئے۔ اور جو قیامت کے دن ضرور اپنے مظالم کا جواب دہ

ہوگا- پانچ چار پٹھانوں کو لیکر شاہ عالم کو دیوان خاص میں بلوایا- اور پھر پوچھا خزانہ کہاں ہے- بادشاہ نے کہا اگر خزانہ میرے پاس ہوتا تو میں ظروف نقرہ وطلائی کو بیچ کر نوکروں کی تنخواہ کیوں تقسیم کرتا- اگر کہیں دفینہ آباؤ اجداد کا ہے تو مجھے اُسکا علم نہیں ہے- ظالم بے رحم نے کہا- جب خزانہ تمہارے پاس نہیں- تو دنیا میں تمہارا رہنا محض بیکار ہے- تمہاری آنکھیں اب نکالی جائینگی- بادشاہ نے آہ سرد بھری- اور کہا یہ آنکھیں ساٹھ برس تک کلام اللہ شریف پڑھتی رہی ہیں ظالم ان پر رحم کر- بے رحم نے اس کے جواب میں بوڑھے بادشاہ کے بیٹوں اور پوتوں کو جو اُس کے ساتھ ہی طلب کئے گئے تھے- بے تحاشا مارنا شروع کیا- بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے- اور کہا ان آنکھوں کو یہ عذاب اور مصیبت نہ دکھا- بہتر ہے کہ نکال لے- وہ سفاک تخت سے اچھل کر بادشاہ کے پاس آیا- اُس کو فرش پر لٹا کر اُسکی چھاتی پر چڑھ بیٹھا- اور خنجر سے اسکی ایک آنکھ نکال لی- دوسری آنکھ کے لئے اپنے ہمراہی کو اشارہ کیا- ہرچند وہ بھی شقی القلب تھا لیکن یہ عبرتناک حالت دیکھکر اُس کا دل لرز گیا- اور اُس نے انکار کر دیا- نمک حرام روہیلے نے اُس کا سر قلم کر دیا- پھر دوسرے پٹھانوں نے اُس کے خوف سے بادشاہ کی دوسری آنکھ نکال لی- اسوقت جو قلعہ اور محلات کی حالت تھی- اُس کا بیان قلم کی طاقت سے باہر ہے- شاہزادے اور بیگمات بیکسی اور رنج وغم کی تصویر بنے ہوئے ہائے شاہ عالم ہائے شاہ عالم کہکر سر پیٹ رہے تھے- اور اسپر تعجب یہ ہے- کہ شہر والوں کو مطلق خبر نہ تھی کہ قلعہ کے اندر کیا ہو رہا ہے- جب شہر کے ہندو مسلمانوں کو اس ظلم کی خبر ہوئی- تو لوگ شہر سے بھاگنے لگے- ۱۴ اگست کو مرہٹے آگئے انہوں نے اس نمک حرام سے بدلہ لینے کا وعدہ کیا- اور لوگوں کو تسلی دی- غلام قادر بھاگ کر میرٹھ چلا گیا- وہاں سے رات کو گھوڑے پر سوار ہو کر اس نیت سے نکلا کہ جمنا پار ہو کر سکھوں سے جا ملوں- رستے میں گھوڑے سمیت ایک کنوئیں میں جا پڑا اور دن نکلنے تک وہیں رہا- کنوئیں والا چرسہ کھینچنے آیا- تو دیکھا کہ ایک خوبصورت آدمی مکلف کپڑے پہنے ڈبکوں ڈبکوں کر رہا ہے- کنوئیں والے نے جو خود بھی اُس کا زخم خوردہ تھا- ذات شریف کو پہچان لیا- اور کہا نواب صاحب سلام!

غلام قادر نے کہا۔ میں غریب سپاہی ہوں۔ مجھے نواب کیوں کہتے ہو۔ جو کچھ میرا اثاثہ تھا سب لٹ گیا۔ اب یہ مالا ئے مروارید ہے۔ یہ لیلو اور مجھے باہر نکالو زمیندار اس کو گھر میں لے آیا۔ اور بند کر دیا۔ مرہٹوں اور بادشاہی آدمیوں کو خبر کی۔ وہ آندھی اور بگولے کی طرح آئے۔ سندھیا (گوالیار) نے اس سفاک کو جو نشۂ حکومت و عیش میں مست ہو کر اپنے انجام سے بے خبر تھا۔ ایک گدھے پر اُلٹا سوار کرایا۔ اور چند سپاہی ساتھ کئے۔ کہ ہر دوکان سے ایک ایک کوڑی جمع کرے۔ اس کے بعد اس کی زبان کاٹی۔ پھر ناک پیر ہاتھ اور کان سب کی صفائی کی۔ سب کے بعد سفاک کے ساتھ وہ سلوک کیا جس کا وہ مستحق تھا یعنی اُس کی آنکھیں خنجر سے نکالی گئیں۔ اور اس کے اعمال کی سزا اسکو دنیا ہی میں دی گئی۔ غرض اس ہیئت کذائی سے ظلم و ستم کی یہ تصویر اندھے بادشاہ کے پاس بھیجی گئی۔ لیکن غلام قادر رستے ہی میں لقمۂ اجل ہو گیا۔ سندھیا نے لاش کو قیمہ قیمہ کر کے بادشاہ کے پاس اُسی دیوان خاص میں بھجوایا۔ جہاں اُس سفاک نے بادشاہ کی بے حرمتی اور خاندان شاہی کی بے عزتی کر کے اپنی نمکحرامی کا ثبوت دیا تھا۔ تمام مؤرخوں نے شاہ عالم کے صبر و استقلال کی تعریف کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ جس وقت اُس سفاک نے بادشاہ کی آنکھوں میں خنجر جھونک دیا تو اُس نے اُف تک نہ کی۔ اور مرضیٔ مولا ہمہ اولیٰ کہتا اور خدا کی یاد کرتا رہا۔ شاہ عالم شاعر تھا۔ اُس نے آنکھیں نکالے جانے کے بعد اپنی زندہ درگور حالت کا آپ مرثیہ لکھا۔ اس میں سے چند شعر ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔

آفتاب فلک رفعت شاہی بودم	بُرد در شام زوال آہ سیاہ کائے ما
چشم ما کندہ شد از جور فلک بہتر شد	تا نہ بینم کہ کند غیر جہاندارئے ما
داد افغاں بچہ شوکت شاہی برباد	کیست جز ذات خدائے کہ کند یارئے ما
کردہ بودیم گنہ ہے کہ سزا اش دیدم	ہست امید کہ بخشند گنہگاریئے ما
شیر دادیم بہ افعی بچہ پرور دیم	عاقبت گشت بجو رپئے خونخوائے ما
آن گدا زادہ ہمداں کہ بہ دوزخ برود	بانئی جور و ستم شد بہ دل افگاریئے ما
گل محمد کہ ز مرداں بہ شرارت کم نیست	چہ قدر کرد و کالت بہ گرفتاریئے ما

ہم الہ یار و سلیمان و بدل بیگ لعین — ہر سہ بستند کمر بر دل آزاریٔ ما
شاہ تیمور کہ دارد سرِ نسبت با من — زود باشد کہ بیاید بہ مددگاریٔ ما
مادھوجی سندھیا فرزند جگر بند من است — ہست معروف تلافیٔ ستمگاریٔ ما
حالِ ما گشتہ بتر ہم چو امامان یزند — کرد تقدیر ازل روز نیٔ ماخواریٔ ما
بود جانکاہ زر و مالِ جہاں ہمچو مرض — دفع از فضلِ الٰہی شدہ بیماریٔ ما
راجہ دراؤ زمیندار امیر و چہ فقیر! — حیف باشد کہ نسازند بہ غمخواریٔ ما
آصف الدولہ و انگریز کہ دلسوز من اند — چہ عجب گر نمایند مددگاریٔ ما
گرچہ ما از فلک امروز حوادث دیدم — باز فردا دہد ایزد سر سرداریٔ ما

دہلی میں انگریزی عملداری

جب ۱۷۹۶ء میں، خواجہ فرید دہلی سے باہر نکلے۔ تو بے چارے شاہ عالم ثانی کی حکومت تھی۔ لیکن ظالم روہیلہ نے اُسکی آنکھیں ابھی نہیں نکالی تھیں۔ اور ہر چند اُس کی سلطنت کی وسعت اُس کی پریشان خیالیوں اور بد نصیبیوں کی شاہد تھی۔ لیکن پھر بھی "بادشاہ دہلی" کا اقتدار مرہٹوں۔ سکھوں اور انگریزوں غرض سب ہم رقیب سلطنتوں میں قائم تھا۔ مگر جب خواجہ فرید ۱۸۱۰ء میں دہلی واپس آئے تو ہندوستان کی یہ قدیم دار السلطنت انگریزی حکومت کے ماتحت تھی۔ جس کی کیفیت یہ ہے۔ کہ ۵ ستمبر ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۹ھ کو لارڈ لیک نے ایک مختصر سی لڑائی کے بعد دہلی کو فتح کر لیا اور جنرل اختر لونی وہاں ریذیڈنٹ مقرر کئے گئے۔ فتح دہلی سے ٹھیک بیس دن بعد یعنی ۶ راکتوبر کو لارڈ لیک نے ہولکر کو متھرا کے قرب و جوار میں جب شکست دی تو ہولکر شکست کھا کر ۸ راکتوبر کو سیدھا دہلی پہنچا۔ اور پیادوں اور سواروں اور سو توپوں کی جمعیت سے دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ دہلی کے اندر جو انگریزی فوج تھی۔ وہ اس کے مقابلہ میں بالکل قلیل تھی۔ لیکن جنرل اختر لونی ریذیڈنٹ دہلی نے اس دانائی اور عقلمندی سے دہلی کے بچانے کا انتظام کر لیا تھا۔ کہ خطرہ کا اب بہت کم اندیشہ باقی تھا۔ لڑائی کئی دن تک جاری رہی۔ ہولکر نے شکست کھائی۔ اور اُس کی فوج کی کثرت جس کے بل بوتے پر اُس نے دہلی پر حملہ کر دیا تھا خاک میں مل گئی۔ دہلی کا

بے اختیار بادشاہ شاہ عالم اُس وقت زندہ تھا۔ اور انگریزوں کے وظیفہ پر گذارہ
کر رہا تھا۔ لیکن لفظ بادشاہ کی عزت و وقعت ہنوز باقی تھی۔ ریزیڈنٹ اور
دیگر انگریزی حکام اور باقی تمام چھوٹی بڑی طاقتیں بادشاہ کا ادب و احترام ملحوظ
رکھتی تھیں۔ بادشاہ نے جنرل اختر لونی کو دہلی کے بچانے کے صلہ میں نصیر الدولہ
معز الملک وفادار خاں بہادر ظفر جنگ کا خطاب دیکر اپنی خوشنودی ظاہر کی۔

اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی اور مرزا جہانگیر کا قید ہونا۔

خواجہ فرید الدین احمد دہلی سے باہر ہی تھے کہ شاہ عالم کا ۱۸ اردسمبر ۱۸۰۶ء مطابق ۷ر
رمضان المبارک ۱۲۲۱ھ کو انتقال ہوگیا۔ اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ جو اپنے باپ
کی طرح انگریزوں کا پنشن خوار تھا۔ ہرچند بادشاہی برائے نام تھی۔ اور حکومت قلعہ کے
اندر ہی تھی۔ لیکن پھر بھی ولی عہدی پر شہزادے اور ان کی طرفدار بیگمات مٹی جاتی
تھیں۔ نواب ممتاز محل بادشاہ کی نہایت پیاری بیوی تھی۔ اُس سے دو لڑکے تھے
ایک مرزا جہانگیر دوسرا مرزا بابر ممتاز محل کی یہ خواہش تھی کہ مرزا جہانگیر ولی عہد ہو اور
بادشاہ بھی اپنی بیگم کے اصرار سے جہانگیر ہی کی ولی عہدی کا خواہاں تھا لیکن در حقیقت
ولی عہدی کا حق مرزا ابن عرف مرزا ابو الظفر کا تھا۔ جو بادشاہ کا سب سے بڑا بیٹا
تھا۔ اور جو آخر میں بہادر شاہ ابوظفر کے نام سے دہلی کا بادشاہ بنا۔ ریذیڈنٹ دہلی
مرزا ابو ظفر کا طرفدار تھا۔ مرزا جہانگیر نے جب دیکھا کہ میری ولی عہدی کا حق تسلیم
کئے جانے میں بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ تو اُس نے فساد کرنا چاہا۔ یہ زمانہ ۱۸۰۹ء کا
تھا۔ اُس وقت مسٹر سٹین ریذیڈنٹ تھے۔ وہ شہزادے کو سمجھانے کیلئے قلعہ
میں گئے۔ جہانگیر اُن سے جلا بیٹھا تھا۔ دیکھتے ہی تنچہ چلایا۔ گولی ٹوپی میں لگی۔ اور
ریزیڈنٹ صحیح و سلامت بچ گیا۔ مرزا جہانگیر نے فوراً قلعہ کے دروازے بند کرلئے۔
ریزیڈنٹ تھوڑی سی فوج لیکر قلعہ کی طرف آیا۔ اور دروازے اکھیڑ کر اندر چلا گیا۔ شاہزادہ
قید ہوگیا۔ اور الہ آباد کے قلعہ میں بھیج دیا گیا۔ اسوقت مرزا جہانگیر کی عمر ۱۹۔ ۲۰ سال سے
زیادہ نہ تھی۔ اس واقعہ کے بعد قلعہ دہلی کے دروازوں پر انگریزی فوج تعینات کردی گئی

اکبر شاہ بادشاہ دہلی کی تنگدستی

خدا کے عجیب کارخانے ہیں۔ وہاں کسی بشر کے لئے یارائے دم زدن نہیں ہے غور کرنے کی بات ہے۔ کہ دہلی اُس دہلی کا بادشاہ جہاں اکبر جہانگیر شاہجہان اور اورنگ زیب جیسے بارعب و اقبالمند بادشاہ لاکھوں اور کروڑوں روپئے خیرات وصدقات میں دے چکے تھے۔ اب اُسی دہلی کا بادشاہ خود لوگوں کا دست نگر اور قرضدار ہے۔ اس سے بڑھکر عبرت کی دردانگیز تصویر اور کیا ہوگی۔ کہ بادشاہ کے وزیر و مشیر نوابان اودھ اور نظام دکن تو وسیع ملکوں کے با اختیار مالک ہوجائیں۔ اور خود بادشاہ قلعہ کی چاردیواری کے اندر ہی حکومت کرے۔ شاہ عالم کے زمانہ سے خزانہ خالی چلا آتا تھا۔ اور اس لیئے اخراجات کی تنگی روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اکبر شاہ کے زمانہ میں بھی وہی حال تھا۔ قلعہ کے اندر جسقدر لوگ رہتے تھے۔ اُن سب کو بادشاہ کی طرف سے تنخواہیں ملتی تھیں۔ اور شہزادوں کے روزینے مقرر تھے۔ لیکن سب اخراجات کی تنگی کی وجہ سے واویلا مچا رہے تھے۔ اکبر شاہ نے لارڈ منٹو گورنر جنرل آف انڈیا کے پاس متعدد درخواستیں اضافہ پنشن کے لئے کیں۔ ابھی کچھ نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ کہ بدقسمتی سے مرزا جہانگیر کی فتنہ انگیزی وقوع میں آگئی۔ جس کی وجہ سے لارڈ منٹو نے اکبر شاہ کی تمام درخواستوں کو مسترد کر دیا۔ اور صرف ساڑھے چھہتر ہزار روپیہ جس کا اقرار لارڈ ولزلی نے کیا تھا۔ ماہوار مقرر کر دیا۔

خواجہ فریدالدین احمد پھر کلکتہ میں

خواجہ فریدالدین احمد بندھیل کھنڈ سے ملازمت ترک کرکے آنے کو تو دہلی میں آگئے لیکن یہاں کے تمام کارخانے ابتر ہو رہے تھے۔ بادشاہ جسکی ذات سے ہزاروں اور لاکھوں لوگوں کی اُمیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ خود محتاج اور بے دست و پا تھا۔ اس لئے وہ یہاں سے پھر کلکتہ چلے گئے۔ وہاں بھی اُنہوں نے ایک کتاب بنام تحفہ لغانیہ صنعت اصطرلاب میں لکھی۔ اور اسی کتاب[1] سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ۱۸۱۵ء میں کلکتہ میں مقیم تھے۔ لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا۔ کہ وہ کس غرض سے وہاں

[1] کتاب کی اصل عبارت یہ ہے تمت الرسالہ جمادی الثانی ۱۲۳۱ھ ہجری در کلکتہ۔ فرید (سیرت فریدیہ)

گئے تھے اور کس تاریخ کو گئے تھے۔

اکبرشاہ ثانی کی خواہشیں

ملازموں اور شاہزادوں کی تنخواہیں دو دو تین تین مہینوں کی سر پر چڑھ گئیں تھیں اور خرچ آمدنی سے اس قدر زیادہ تھا کہ آئندہ کوئی طریقہ ایسا نظر نہ آتا تھا جس سے بار قرض سے سبکدوش ہونے کا موقع مل سکے۔ اکبرشاہ ان خرابیوں کی وجہ سے نہایت پریشان رہا کرتا تھا۔ بادشاہ کی اب خواہش یہ تھی کہ اخراجات کم ہو جائیں۔ یا کسی طریق سے پنشن میں اضافہ ہو جائے۔ نیز دلی خاص اور اس کے مضافات پر خاص اپنی ذاتی حکومت کا خواہاں تھا۔ جس میں اور کسی کا دخل نہ ہو۔ اور انگریزوں سے کم سے کم تین لاکھ روپئے ماہوار محاصل ملک سے حاصل کرنیکی آرزو رکھتا تھا۔ لیکن بظاہر کسی آرزو کے پورا ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

خواجہ فریدالدین احمد کو خطاب اور خلعت وزارت

خواجہ فریدالدین احمد کے داماد سید محمد متقی خاں خلف جوادالدولہ جواد علی خاں کو دربار شاہی میں رسوخ کامل تھا۔ اکبرشاہ زمانہ ولی عہدی میں اُس کے ساتھ کھیلتے رہے تھے۔ جب تخت پر بیٹھے تو ارتباط کو اور بھی ترقی ہوگئی۔ اور یہاں تک بڑھی۔ کہ بادشاہ کبھی کبھی اُن کو بھائی متقی کہکر پکارا کرتے تھے۔ بادشاہ نے اپنی پریشانیوں سے سید محمد متقی خاں کو آگاہ کیا۔ اور چاہا کہ وہ سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لیں۔ اور ان خرابیوں کو رفع کریں۔ سید محمد متقی نے اس خیال سے کہ اس نئے تعلق سے وہ پہلا ارتباط ممکن ہے قائم نہ رہ سکے۔ اپنے آپکو اس عہدے کے ناقابل بتایا۔ اور اپنے خسر خواجہ فریدالدین احمد کا بادشاہ سے ذکر کیا۔ اور اُن کی سفارت ایران اور دیگر انگریزی خدمات اور ان کی کامیابیوں کو بوضاحت بیان کیا۔ اور یہ مشورہ دیا۔ کہ وہ دہلی کے رہنے والے ہیں۔ یہیں ان کی بود و باش ہے۔ اس قابلیت کا آدمی ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہیئے۔ اُن کو بُلاکر وزارت دیدی جائے۔ غالب اُمید ہے کہ وہ ان سب خرابیوں کا کافی انتظام کرلینگے۔ بادشاہ نے اس مشورہ کو پسند کیا۔

اور خواجہ فریدالدین احمد کلکتہ سے بلوائے گئے۔ ۱۸۱۵ء مطابق ۱۲۳۱ھ کے آخر میں خواجہ فرید دہلی میں آئے۔ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اکبرشاہ نے وزارت شاہی کی خوشخبری سُنائی۔ اور خلعت وزارت کے ساتھ نواب دبیرالدولہ امین الملک مصلح جنگ کا خطاب عطا کیا۔

نواب دبیرالدولہ کا انتظام

خواجہ فریدالدین احمد نے قلمدان وزارت ہاتھ میں لیکر جب بادشاہ کے آمد و خرچ پر نظر دوڑائی تو زمین آسمان کا فرق نظر آیا۔ قرضہ کی ادائیگی اور مقررہ ماہوار تنخواہوں کے بروقت ادا ہونے کی کوئی سبیل دکھائی نہ دیتی تھی۔ آخر ایک عرصہ کے غور و فکر کے بعد قرضہ بے باق اور اخراجات برابر کرنے کیلئے چار تدبیریں اختیار کیں۔

۱۔ تمام شاہزادوں۔ بیگماتوں۔ ملازموں اور عملۂ شاہی کی تنخواہوں سے دس روپیۂ فی صدی تنخواہ کم کردی۔ جس میں دبیرالدولہ کی اپنی تنخواہ بھی شامل تھی۔

۲۔ شاہی باورچی خانہ دو قسم کا تھا۔ ایک کا نام بڑا خاصہ اور ایک کا چھوٹا خاصہ تھا۔ جس کا روزانہ خرچ سینکڑوں روپیوں تک پہنچتا تھا۔ اس کو یک قلم موقوف کردیا۔

۳۔ غیر ضروری کارخانجات جن میں عیش پرستی اور تفریح طبع کے سامان تھے۔ یکلخت بند کردیئے۔

۴۔ دیوان عام کی چھت میں تانبے کی موٹی چادریں بطور چھت گیری کے لگی ہوئی تھیں جن پر سنہری ملمع تھا۔ اور جن کو بھاؤ مرہٹہ نے ۱۷۵۷ء میں بعہد شاہ عالم بادشاہ ساتھ لیجانے کے لئے اُکھاڑ ڈالا تھا۔ اور آخر ناکام رہا تھا۔ یہ چادریں چھت سے اکھڑی ہوئی صاف طور پر معلوم ہوتی تھیں ان کا ازسرنو مکمل ہونا بہ نظر حالات موجود ناممکن نظر آتا تھا۔ نواب دبیرالدولہ نے چھت پر سے سونے کے ورق الگ اترو الیا اور جس قدر تانبا نکلا شاہی ٹکسال میں اُس کے پیسے بنوالئے۔ اور پیتل جسقدر مہیا ہوسکا۔ اس کو فروخت کردیا۔

ان تدابیر سے بادشاہ کا کئی لاکھ روپیہ کا قرض بہت تھوڑے عرصہ میں ادا

ہوگیا۔ اور آمدنی جو خرچ سے بہت کم ہوا کرتی تھی۔ ماہوار اخراجات کے برابر ہوگئی۔ اور تمام ملازموں اور شہزادوں اور بیگماتوں کو ماہوار تنخواہیں اور وظیفے ملنے لگے۔

نواب دبیر الدولہ سے عام ناراضگی

جن لوگوں کے وظیفے اور ماہوار تنخواہیں کم ہوگئی تھیں۔ اور جو لوگ شاہی باورچی خانوں اور مختلف کارخانجات کے بند ہونے سے پریشان حال اور بیکار ہوگئے تھے۔ اُنہوں نے نواب دبیر الدولہ کے خلاف ایک عام ناراضگی ظاہر کی شہر اور قلعہ کے تمام لوگ اُن کے دشمن ہوگئے۔ سارے شہر اور قلعہ میں مخالفوں نے اس بات کو مشہور کردیا کہ دیوان خاص کی چاندی کی چھت نادر شاہ ایرانی لوٹ کے لیگیا اور دیوان عام کی تانبے کی چھت خواجہ فرید کشمیری نے لوٹ لی ہے۔ یہ شکائتیں رفتہ رفتہ بادشاہ تک پہنچیں۔ اورنگ زیب کے بعد بادشاہوں کے کان رہگئے تھے۔ آنکھیں بند ہوگئی تھیں جو کچھ سُنتے تھے اُسپر عمل کرتے تھے۔ اور اپنی آنکھوں سے کچھ نہ دیکھ سکتے تھے دبیر الدولہ کی تدابیر سے بادشاہ کا سارا قرض ادا ہوگیا تھا۔ جو لوگ شاکی تھے۔ اور جن کی تنخواہیں تین تین چار چار ماہ تک بادشاہی خزانہ پر چڑھی رہتی تھیں۔ وہ بھی اب ماہوار تنخواہ وصول کرلیا کرتے تھے۔ شکایت ان خودغرضوں کو یہ تھی کہ تنخواہوں میں دس فی صدی کی کمی آگئی تھی۔ حالانکہ اس کمی میں خود دبیر الدولہ بھی شامل تھے۔ انکے علاوہ خود غرضوں کی ایک اور جماعت تھی۔ جس نے سب سے زیادہ دبیر الدولہ کو بدنام کردیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے۔ جو بادشاہی باورچی خانہ سے ہر روز دو وقت کا کھانا کھایا کرتے تھے۔ اور جن کو بادشاہ کی ذات سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ انہیں کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل تھے جن کو دبیر الدولہ نے بیکار محض سمجھہ کر موقوف کردیا تھا۔ اور جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز تھی۔ بادشاہ کے پاس جب خوشامدیوں نے چاروں طرف سے جمع ہوکر شکائتوں کے انبار لگادیئے۔ اور یہ کہنا شروع کیا۔ کہ آپ اُس خاندان کی نسل سے ہیں جس نے خیرات زکواۃ اور صدقات اور مختلف تفریح طبع کے سامانوں کے لئے الگ الگ محکمے قائم کئے تھے۔ جب تک بادشاہ کے دستر خوان پر

ہزار پانسو آدمی جمع نہ ہوں اور جب تک لوگوں کی (خواہ وہ بیکار ہی کیوں نہ رکھے جائیں) پرورش نہ کی جائے۔ بادشاہت کا رُعب داب قایم نہیں رہ سکتا۔ آپ قلمدان وزارت کسی قدیم نمک پروردہ کو عنایت کرتے تو آج سارے شہر ملکہ سارے ملک میں جو ایک عام واویلا مچا ہوا ہے وہ سننے میں نہ آتا۔

دبیرالدولہ کا وزارت سے استعفا

بادشاہ پر خود غرضوں کی ان شکایات نے اثر کیا۔ اور ہرچند اُس نے ظاہر نہ کیا لیکن وہ اندر ہی اندر دبیرالدولہ سے کبیدہ خاطر رہنے لگا۔ دبیرالدولہ نہائیت دور اندیش تھے۔ جب انہوں نے بادشاہ کی یہ بے رُخی اور بے اعتنائی دیکھی۔ اور بعض لوگوں کو بادشاہ کے ایما سے بگستاخی پیش آتے دیکھا۔ تو اس عہدہ کا ہاتھ میں رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ اور تھوڑے عرصہ کے بعد استیعفا دیکر کلکتہ چلے گئے۔

نواب ممتاز محل جو بادشاہ کی چاہتی بیگم تھی۔ اور جس کی طرفداری اور حمایت نے مرزا جہانگیر کو الہ آباد کے قلعہ میں قید کرا دیا تھا۔ اب وزارت کے تمام اختیارات خود استعمال کرنے لگی۔

بادشاہ دہلی کا مراسلہ اضافۂ پنشن کے لئے

بادشاہ بیگم جس نے اپنی نادانیوں اور حماقتوں سے اپنے فرزند کو قید میں ڈلوا دیا تھا۔ دہلی کی وزارت کا کاروبار کس طرح انجام دے سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد بادشاہ اخراجات سے پھر مجبور ہوگئی۔ ملازم اور شاہزادے تنخواہوں اور وظیفوں کے نہ ملنے سے پھر چیخنے چلانے لگے۔ اور وہی لوگ جو نواب دبیرالدولہ کے شاکی تھے۔ اب اُن کے زمانہ وزارت کو یاد کرنے لگے۔ البتہ وہ لوگ خوش تھے۔ جنکی دبیرالدولہ کی وزارت میں پیش نہ جاسکتی تھی۔ اور جو ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھے ہوئے تھے۔ اضافہ پنشن کے متعلق بادشاہ کی کئی درخواستیں نامنظور ہو چکی تھیں لیکن دنیا باُمید قایم کے مطابق کچھ نہ کچھ ڈھارس چلی جاتی تھی۔ جب بادشاہ بیگم کے زمانۂ وزارت میں تنگدستی کا زور ہوگیا۔ تو بیگم کے مشورہ سے اضافہ پیشکش کا ایک مراسلہ گورنر جنرل

کی خدمت میں لکھنے کا ارادہ کیا گیا۔ جس میں زیادہ تر یہی شکائیت تھی کہ آمدنی اخراجات ضروری کے لئے بھی ناکافی ہے۔ اس لئے وظیفہ میں ضرور ابزادی ہونی چاہیئے۔

سید محمد متقی خاں کا مشورہ

سید محمد متقی خاں نے ابتدا میں تو بادشاہ کے مسودہ عرضداشت میں دخل نہ دیا۔ کیونکہ بادشاہ ان کے خسر نواب دبیر الدولہ سے ناراض تھے۔ لیکن جب عرضداشت بھیجنے کی تمام بحث ونزاع ہو چکی۔ تو محمد متقی نے ایک دن موقع پاکر عرض کیا کہ جو کچھ حضور عالم نے مسودہ بھیجنے کے متعلق تجویز فرمائی ہے وہ نہائیت مناسب ہے۔ لیکن نواب دبیر الدولہ آجکل کلکتہ ہی میں موجود ہیں۔ اُن کو یہاں کا سب جمع خرچ کوڑی کوڑی کا معلوم ہے۔ بلکہ یادداشتیں بھی اُن کے پاس موجود ہیں۔ جن کے رُو سے اُنہوں نے آمدنی اور خرچ کو برابر کردیا ہے۔ جب ادھر سے مراسلہ جائیگا۔ کہ آمدنی خرچ کو ناکافی ہے اور اُدھر دبیر الدولہ اپنی یادداشتیں گورنر جنرل کو دکھائیگا۔ تو حضور غور فرما سکتے ہیں۔ کہ اُس مراسلہ کا نتیجہ کیا نکلیگا۔

دبیر الدولہ پھر عہدۂ وزارت پر

گو بادشاہ بیگم اور بعض اور لوگوں نے جن کو اپنے اختیارات کے سلب ہوجانے کا اندیشہ تھا سید محمد متقی خاں کے اس مشورہ کی مخالفت کی۔ لیکن یہ مشورہ جو درحقیقت نیک نیتی پر مبنی تھا۔ بادشاہ کے دل پر اثر کر گیا۔ فرمایا۔ بھائی متقی! تم کہتے تو ٹھیک ہو لیکن اس کی اب تدبیر کون سی ہے۔ محمد متقی نے عرض کیا دبیر الدولہ کا وزارت سے علیحدہ کردینا مصلحت سے خالی تھا۔ اگر اضافۂ پنشن میں کچھ کوشش ہوسکتی تھی تو وہ دبیر الدولہ ہی کے ذریعہ ممکن تھی۔ کیونکہ سرکار انگریزی میں بھی اُس کا بہت بڑا رسوخ ہے۔ بادشاہ نے فرمایا کیا اب وہ واپس دہلی آسکتے ہیں۔ محمد متقی نے کہا۔ اگر حضور ان کو یاد فرمائینگے تو یقیناً اُن کو کوئی عذر نہ ہوگا۔ غرض بادشاہ نے وزارت کی سند اُن کے نام لکھی۔ اور کلکتہ سے اُن کے بُلانے کا حکم دیا۔ وہ آئے اور ۱۸۱۹ء مطابق ۱۲۳۵ھ میں

دوبارہ دہلی کی وزارت پر متمکن ہوئے - ٹھیک اسی سال انگلستان میں اُس نامور ہر دلعزیز اور زندہ جاوید ملکہ نے جنم لیا تھا - جس کا نام ملکہ معظمہ وکٹوریا تھا - اور جس نے ہندوستان اور انگلستان اور دیگر انگریزی مقبوضات میں چوسٹھ سال تک نہائیت شان وشوکت سے حکومت کی تھی - اور جس کا پوتا ہونے کا ہمارے موجودہ شہنشاہ حضور جارج پنجم خلد اللہ ملکہ کو افتخار حاصل ہے -

دبیرالدولہ سے بادشاہ کی پھر ناراضگی

وزارت کا چارج لئے دبیرالدولہ کو کئی مہینے ہوگئے - بادشاہ نے مراسلہ بھیجنے کیلئے کئی دفعہ صلاح مشورہ کیا - لیکن دبیرالدولہ ہمیشہ آجکل کے وعدے پر ٹالتے رہے اور گو لکھا ہے کہ ابھی تک یہ راز سربستہ ہے - کہ اُنھوں نے بادشاہ کی ماہواری پنشن کے اضافہ کی جو بنام پیشکش بادشاہ کے لئے مقرر تھی - کیوں کوئی کوشش نہ کی - لیکن آگے چلکر معلوم ہوجائیگا - کہ درحقیقت یہ لیت ولعل بلاوجہ نہ تھی - غرض بادشاہ کی کبیدگی بڑھتی گئی - اور وہ لوگ جو دبیرالدولہ کے ابتدا سے مخالف تھے - بادشاہ کے حضور میں نمک مرچ لگا کر اُس کے متعلق باتیں کرنے لگے - اور یہانتک مشہور کردیا کہ دبیرالدولہ اندرونی طور پر انگریزوں سے سازش رکھتے ہیں - اور بادشاہ کے تمام کاروبار اور اسراروں سے گورنر جنرل کو آگاہ کرتے رہتے ہیں - دبیرالدولہ کے تساہل اور لیت ولعل سے بادشاہ کو بھی بدگمانی ہوگئی وزارت سے ان کا الگ کرنا تو مناسب نہ سمجھا - البتہ اُن کو کمزور بنانے کی یہ ترکیب نکالی کہ تین اور آدمیوں کو وزارت میں اُن کا شریک بنا دیا - ایک نواب محمد میر خاں تھے - جن کے باپ شاہ جی ۱۸۰۳ء تک دہلی کے صوبہ رہے - دوسرے راجہ کیدار ناتھ اور تیسرے راجہ جے سکھ رائے جس کی طرفدار نواب ممتاز محل بیگم تھیں -

دبیرالدولہ کا پھر استیعفا

یہ شراکت ۱۸۲۰ء مطابق ۱۲۳۶ھ سے شروع ہوگئی - دبیرالدولہ شراکت کی وزارت کو ناپسند کرتے تھے - بلکہ یہ کہنا شائید زیادہ مناسب ہے - کہ وزارت

اب انہیں ایک بوجھ معلوم ہو رہی تھی۔ دبیرالدولہ اگر ایک شخص کو کوئی عہدہ دیتے تھے تو باقی تینوں اس کی موقوفی کی رائے پاس کر دیتے تھے۔ غرض دبیرالدولہ اگر کوئی تجویز پیش کرتے تو خواہ وہ کیسی ہی نیک اور مفید کیوں نہ ہوتی فوراً اُس کی مخالفت کر دی جاتی۔ دو اڑھائی سال اسی طرح گذرے۔ لیکن آخر صبر و تحمل کا پیالہ چھلک گیا۔ اور دبیرالدولہ اس وزارت کو جو درحقیقت اب ایک ذلت تھی نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ جنرل اختر لونی ریذیڈنٹ دہلی اُن کے نہایت گہرے دوست تھے اُنھوں نے باقی تینوں شریک وزیروں کی فقرہ بازیوں اور اپنی مجبوریوں سے انہیں آگاہ کیا۔ اور آخر جنرل اختر لونی کی صلاح سے ۱۸۲۳ء مطابق ۱۲۳۸ھ ہجری میں تین ساڑھے تین سال کی وزارت کے بعد دوبارہ استیعفا دیدیا۔

بادشاہ کیطرف سے راجہ رام موہن رائے[۵] کی روانگی

نواب دبیرالدولہ کے استیعفا کے بعد نواب محمد میر خاں راجہ کیدارناتھ اور راجہ جے سکھ رائے دہلی کی وزارت پر متمکن تھے۔ لیکن بادشاہ بیگم چونکہ راجہ جے سکھ رائے کو پسند کرتی تھی۔ اس لئے رفتہ رفتہ راجہ جے سکھ رائے نے سب پر اقتدار حاصل کر لیا۔ راجہ جے سکھ رائے بادشاہ بیگم اور دیگر اراکین سلطنت نے اضافہ پنشن کے لئے ایک جان توڑ کوشش شروع کی۔ تاکہ نواب دبیرالدولہ کو معلوم ہو جائے۔ کہ جو کام تم سے نہیں ہو سکا یا جو کام تم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ ہم نے سرانجام کر لیا ہے۔ راجہ جے سکھ رائے کی وساطت سے رام موہن رائے کلکتہ سے دہلی میں بلوائے گئے۔ بادشاہ نے اُن کو راجہ کا خطاب عطا فرمایا۔ اور وہ بادشاہ کے وکیل کی حیثیت سے لنڈن بھیجے گئے۔ جہاں وہ ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۷ھ کو پہنچے۔ ابھی اس معاملہ کا کچھ تصفیہ نہیں ہوا تھا۔ کہ راجہ رام موہن رائے ۱۸۳۳ء میں انگلستان

---

[۵] راجہ رام موہن رائے کی پیدائش ۱۷۷۲ء میں بمقام رادھا نگر ضلع ہوگلی ملک بنگال میں ایک برہمن کے گھر ہوئی۔ راجہ رام موہن رائے ہندوستان کے بہت بڑے ریفارمروں میں سے تھے۔ اس نے ہندو قوم میں بہت بڑی اصلاحیں کیں وہ سنسکرت فارسی عربی اور انگریزی کا بہت بڑا عالم تھا۔ اور ان زبانوں میں اُس نے کئی کتابیں بھی تصنیف کیں ۱۸۳۳ء میں اسکا انتقال ہوگیا۔ فوق

ہی میں انتقال کرگیا۔ اور اگر وہ زندہ رہتا۔ جب بھی اضافہ پنشن کی کوئی توقع نہ تھی جیساکہ آگے چلکر معلوم ہوگا۔

پیشکش میں اضافہ نہونے کیوجہ

سیرت فریدیہ میں ان ناکامیوں اور مایوسیوں کا اصل سبب درج ہے۔ جس کا خلاصہ ان الفاظ میں یہ ہے کہ جب شاہ عالم کو انگریزوں نے مرہٹوں کے پنجہ سے نجات دی۔ تو لارڈ لیک نے شاہ عالم سے ایک عہدنامہ کیا تھا۔ جس کے رُو سے بغیر انگریزوں کی وساطت سے کسی غیر سلطنت سے کوئی کاروبار نہیں رکھ سکتے تھے۔ لیکن جب اس عہدنامہ کے بعد مرہٹوں اور انگریزوں میں جنگ ہوئی تو دوران جنگ ہی میں شاہ عالم نے اپنی مشہور کم بختیوں سے ایک کم بختی یہ کی کہ مرہٹوں کے ساتھ خط کتابت شروع کردی۔ سو وہ خطوط یا اُن میں سے بعض کسی نہ کسی ذریعہ سے لارڈ لیک کے ہاتھ آگئے۔ اور یہی خطوط تھے جن کے باعث لارڈ لیک نے اُس عہدنامہ کو جو شاہ عالم سے کیا تھا زائل اور ساقط کردیا تھا۔ اور حقیقت میں اب کوئی باہمی عہدنامہ نہ تھا۔ انگریزوں کو کلی اختیار تھا کہ وہ بادشاہ کی پیشکش بند کردیتے۔ یا جاری رکھتے یا کم کردیتے۔ لیکن انہوں نے پیشکش کو برابر جاری رکھا۔ اور اپنی ناراضگی کو بادشاہ اور بادشاہی خاندان پر مطلق ظاہر نہ کیا۔ یہ ناراضگی نہ صرف شاہ عالم تک ہی رہی بلکہ اکبر شاہ اور اسکے بیٹے ابوظفر بہادر شاہ آخری بادشاہ سلاطین مغلیہ تک جاری رہی۔ بہادر شاہ نے بھی اپنے عہد حکومت میں اضافہ پنشن کی بہت کوشش کی حکیم احسن اللہ خاں ایک انگریز کو وکیل شاہی مقرر کرنے کے لئے خود کلکتہ گئے۔ بادشاہ کی خدمت میں اُس کو پیش کیا۔ جنہوں نے اپنا وکیل مقرر کرکے اُس کو لنڈن روانہ کردیا۔ ایک دفعہ بہادر شاہ کو کامیابی بھی ہوگئی تھی۔ اور سرکار انگریزی نے اضافہ پیشکش منظور فرماکر سوا لاکھ روپیہ ماہوار تک کردیا تھا بلکہ رقم بھی بادشاہی خزانہ میں آگئی تھی۔ لیکن بعد میں جسقدر اضافہ تھا سب واپس لے لیا گیا۔

نواب دبیرالدولہ کا کیا قصور تھا؟

نواب دبیرالدولہ کو پیشکش میں اضافہ نہ ہو سکنے کی سب وجوہات معلوم تھیں۔ اور اسی لئے وہ بادشاہ کو مراسلہ بھیجنے اور وکیل شاہی مقرر کرنے کی صلاح نہیں دیتے تھے سیالیت و لعل میں ٹال دیتے تھے۔ وہ بادشاہ دہلی کی ملازمت سے پہلے سرکار انگریزی کے نمکخوار تھے۔ اور پولیٹکل محکمہ جات میں اعلےٰ اور نہایت ذمہ واری کے عہدوں پر کام کرنے کی وجہ سے پولیٹکل رازوں کی اہمیت اور انکے اخفا کی ذمہ واریوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے۔ کہ انگریزی قوم کے آفتاب اقبال کی شعاعیں انگلستان کی سرزمین سے گذر کر ہندوستان کے وسیع ملک پر اپنا عکس ڈال رہی ہیں۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے۔ کہ مغلیہ خاندان کا عروج جو وسعت میں دہلی سے نکلکر کشمیر پنجاب افغانستان اودھ بنگال بہار دکن راجپوتانہ وسط ہند غرض تمام ہندوستان کو گھیر لینا تھا۔ اب دہلی میں بھی قلعہ کی چاردیواری سے باہر نظر نہیں آتا۔ ایسی حالت میں اگر گورنمنٹ انگلشیہ کی ناراضگی جو بادشاہ دہلی سے تھی۔ دبیرالدولہ اکبرشاہ سے ظاہر کر دیتا۔ تو پولیٹکل نکتہ دانوں سے پوچھنا چاہیئے۔ کہ یہ جرم اخلاقی اور قانونی لحاظ سے سزا کا کونسا انتہائی درجہ رکھتا ہے۔ دبیرالدولہ پر مخالفوں اور بادشاہ کے خوشامدیوں نے انگریزوں سے سازش رکھنے کا الزام بھی لگایا۔ اس کے متعلق اور بھی بہت سی باتیں تراشی گئیں۔ لیکن وہ اپنا پولیٹکل فرض ادا کرنے میں برابر سرگرم رہے۔ اور اگر وہ ظاہر بھی کر دیتے جس کی ان سے مطلق توقع نہ تھی۔ تو بھی یہ کس طرح ممکن تھا۔ کہ ان کے صرف ظاہر کر دینے سے گورنمنٹ انگلشیہ جو اپنے حقوق و فوائد کو سب سے بہتر جانتی ہے۔ شاہ عالم کے بہت بڑے پولیٹکل قصور کو جس نے عہد نامہ کو فسخ کر دیا تھا۔ معاف کر دیتی۔ گورنمنٹ کی یہ ناراضگی اکبرشاہ کے زمانہ میں مرزا جہانگیر کی نادانیوں اور بادشاہ بیگم کی حماقتوں کے باعث اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس لئے دبیرالدولہ پر جو یہ الزام لگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کہ وہ بادشاہ کے اضافۂ پیشکش میں ہارج بنا۔ بالکل بے بنیاد اور خلاف قیاس ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور نواب دبیرالدولہ

نواب دبیرالدولہ نے جس خوبی اور تندہی سے سرکار انگریزی کی پولیٹکل خدمات کو اختتام تک پونچایا تھا۔ اور جو ناموری دبیرالدولہ نے ایران میں حاصل کی تھی۔ اور جن عمدہ تدابیر سے اُنھوں نے بادشاہ دہلی کو قرضہ کے بوجھ سے نجات دیکر اُن کا خرچ آمدنی کے برابر کردیا تھا۔ یہ سب خبریں پنجاب میں بھی پہنچ رہی تھیں جہاں اُن دنوں رنجیت سنگھ شیر پنجاب کی شکل میں اردگرد کے رئیسوں پر غرا رہا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ گو خود بے علم تھا۔ لیکن مردم شناسی میں درجۂ کمال رکھتا تھا۔ اُس نے اپنے دربار میں نہایت عالم مدبر اور جنگجو آدمی جمع کر رکھے تھے۔ جب اُس نے سُنا کہ نواب دبیرالدولہ وزارت دہلی سے مستعفی ہوگیا ہے۔ تو فوراً چند معتمد معہ تیس ہزار روپیہ سفر خرچ کے دہلی میں بھیجے۔ اور تاکید کی کہ جس طرح ہوسکے نواب دبیرالدولہ کو وزارت پنجاب پر آمادہ کرکے ہمراہ لے آؤ۔ بلکہ خریطۂ شاہی کے ذریعہ بُلوا بھیجا۔ نواب دبیرالدولہ کی اپنی اور باقی تمام خاندان کی یہ خواہش تھی کہ وہ اس بے مثال عزت کو جو بغیر وسیلہ اور سفارش اور بغیر کوشش کے تمام پنجاب کی وزارت عظمیٰ کی صورت میں دست بستہ سامنے کھڑی ہے۔ قبول کرلیں۔ لیکن اُن کی بڑی بیٹی عزیز النسا بیگم نے نہایت آزادی اور جراءت سے مخالفت کی اور کہا۔ کہ خدا نے مال و دولت آپ کو اسقدر دیا ہے کہ آپ کی کئی پشتیں بآرام گذارہ کرسکتی ہیں۔ اور اگر اس سے اور زیادہ دولت بھی جمع ہوجائے تو بھی موجودہ آرام و آسائش میں کچھ اور زیادتی نہیں ہوسکتی۔ اگر عزت کی طرف دیکھا جائے تو خدا کا فضل شامل حال ہے۔ سرکار میں دربار میں سب جگہ رسوخ اور وقعت ہے۔ اس ضعیفی کے عالم میں لاہور جانا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بادشاہی کے اختیارات لینا۔ اور ہم سب کا انگریزی عملداری میں رہنا مصلحت سے بعید ہے۔ معلوم نہیں پنجاب کی حکومت میں کیا انقلابات پیش آئیں اور دہلی کی بادشاہی میں کیسے اتفاقات گذریں ہمیں آپ کی علالت سے تفکرات۔ ان حالات میں آپ کا دہلی چھوڑ کر لاہور جانا مجھے کسی صورت میں پسند نہیں۔ دبیرالدولہ کے دل پر بیٹی کی دور اندیشانہ تقریر نے نہایت اثر کیا۔ اور سفر خرچ واپس کرکے وزارت پنجاب سے انکار کردیا

اور مہاراجہ کی اس عنایت خسروانہ کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

دبیرالدولہ کا وزارت دہلی سے انکار

اب عمر قریباً اسی سال کے قریب پہنچ چکی تھی۔ عمر کا یہ وہ حصہ ہے جس میں انسانی قواء جواب دیتے جاتے ہیں۔ آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں دانت گر جاتے ہیں۔ سر جھکا جاتا ہے۔ کمر خمیدہ ہو جاتی ہے۔ ہاتھوں میں رعشہ آجاتا ہے۔ اور پاؤں چلنے سے رہ جاتے ہیں۔ بلکہ کئی لوگ اس عمر تک پہنچتے ہی نہیں۔ لیکن نواب دبیرالدولہ اسی سال کی عمر تک اپنے ہوش و حواس میں تھے۔ اور معمولی کاموں کے علاوہ بڑے بڑے کام بھی انجام دے سکتے تھے۔ چنانچہ اسی عمر میں بادشاہ دہلی نے پھر ایک دفعہ آپ کو یاد کیا اور وزارت کا بوجھ آپ کے کندھوں پر رکھنا چاہا۔ لیکن نواب دبیرالدولہ نے انکار کر دیا۔ اور پھر آخر عمر تک کوئی تعلق کسی سے پیدا نہ کیا۔

جنرل اختر لونی اور نواب دبیرالدولہ

جنرل اختر لونی ریذیڈنٹ دہلی نواب دبیرالدولہ کے نہایت ہمدرد دوستوں میں تھے۔ ان کی خاطر وزیر اعظم کی مسند پر ایک لال مخمل کی عمدہ آرام کرسی ہمیشہ رکھی رہتی جنرل اختر لونی اکثر دبیرالدولہ کے پاس آیا کرتے تھے۔ اور جتنی دیر چاہتے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ دبیرالدولہ خود مسند پر بیٹھتے تھے۔ اور جنرل صاحب کرسی پر بیٹھا کرتے تھے۔ ریزیڈنٹ کا آنا اور بار بار آنا اور ازراہ دوستی آنا۔ اور بے تکلفانہ چلے آنا معمولی بات نہیں ہے۔ یہ وہ اعزاز ہے جو والیان ریاست میں سے بھی غالباً کسی کو نصیب نہیں۔ اور یہ اعزاز اس بات کا شاہد ہے کہ دبیرالدولہ کا رسوخ کس قدر وسیع تھا۔

جنرل اختر لونی۔ دبیرالدولہ۔ اور سر سید احمد خاں

ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر سیرت فریدیہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ایکدن جنرل اختر لونی

میرے نانا دبیرالدولہ کے ہاں آئے ہوئے تھے۔میری عمر اُس وقت پانچ چھ سال کی تھی۔ میں نانا کے پاس جا رہا تھا۔جنرل صاحب کو جب بیٹھے دیکھا تو واپس آنے لگا۔مگر انھوں نے آواز دیکر بُلا لیا پھر لکھتے ہیں جنرل صاحب فل ڈریس پہنے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا آپ نے ٹوپی میں پر کیوں لگا رکھے ہیں۔ اور کوٹ میں دُہرے بٹن کیوں لگائے ہیں۔ لکھتے ہیں جنرل اس سوال سے بہت خوش ہوئے اور مُسکرا کر خاموش ہو رہے۔

نواب دبیرالدولہ کا انتقال

آخر وہ دن آگیا کہ سرائے فانی کے اس جلیل القدر مسافر کو کوچ کے لئے تیار ہونا پڑا۔ بیاسی سال کی عمر تھی کہ موت کے فرشتہ نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا یہاں پہلے ہی انتظار تھا۔ اور اسی انتظار میں بیاسی سال گذر گئے تھے ملے اور اس شوق سے ملے کہ بس اُسی کے ہو گئے۔اور بیٹوں پوتوں نواسوں نواسیوں اور تمام خویش و اقارب سے صرف ایک نامعلوم وجود ملک الموت کی خاطر آنکھیں پھیر لیں۔ محرم ۱۲۴۴ھ ہجری کی چودھویں تاریخ تھی۔اور مسیحی صدی اٹھارھویں منزل طے کر رہی تھی۔کہ نواب دبیرالدولہ مصلح جنگ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد وزیر شاہ دہلی نے اجل کو لبیک کہا۔ بیرون ترکمان دروازہ چونسٹھ کھنبہ میں جہاں اُن کے بھائی کے نام سے شاہ فدا حسین کا ایک مشہور تکیہ ہے۔ وہاں آپ بہ اعزاز و اکرام دفن کئے گئے۔ اُن کی قبر پر نہایت عمدہ اور نفیس عمارت تعمیر کیگئی اُن کے قابل فرزندوں نے سوم اور چہلم کی رسوم پر ہزارہا روپئے خرچ کر دیئے۔ اُن کے مزار پر ایک عرصہ تک بسنت کا میلہ ہوتا رہا۔اور اس شان و شوکت اور رونق و عمدگی سے ہوتا تھا۔کہ بوجہ قرب شہر کے شہر کی تمام درگاہوں کی بسنتوں پر فوق لیگیا تھا۔

نواب دبیرالدولہ کی اولاد

نواب دبیرالدولہ کی تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ اور یہ سب اولادیں ایک

ہی بیوی سے تھیں۔ تین تین سال کی کمی بیشی سے تینوں لڑکیاں اور دونوں لڑکے ۱۷۹۲ئ مطابق ۱۲۰۷ھ تک پیدا ہو چکی تھیں۔ لڑکیوں کے نام یہ تھے۔ سب سے بڑی عزیز النساء بیگم جو مسلمانان ہندوستان کے مشہور لیڈر اور علی گڈھ کالج کے بانی آنریبل جواد الدولہ عارف جنگ ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر کے سی آئی ای مرحوم و مغفور کی والدہ تھیں۔ اور جنکے حالات آئندہ صفحات میں مفصل لکھے جائینگے دوسری کا نام فاطمہ بیگم اور تیسری کا نام فخر النساء بیگم تھا۔

لڑکوں میں بڑے لڑکے کا نام خواجہ وحید الدین احمد اور چھوٹے کا نام زین العابدین خاں تھا۔ دونوں لڑکوں کے حالات الگ الگ عنوانوں سے آئندہ سطور میں لکھے جائینگے۔ بیٹے بیٹیاں داماد پوتے نواسے نواسیاں اور پوتیاں ہوئیں۔ غرض ایک بہت بڑا کنبہ تھا۔ جس کو نواب دبیر الدولہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ اور ان کو دیکھ دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔

ریذیڈنٹ و اسسٹنٹ ریذیڈنٹ دہلی کا ماتم پرسی کو آنا۔

جب نواب دبیر الدولہ کا انتقال ہوا۔ تو جنرل اختر لونی کی جگہ مسٹر کول بروک دہلی کے ریذیڈنٹ تھے اور اسسٹنٹی پر مسٹر ٹرولین تعینات تھے۔ ہرچند ان دونوں صاحبوں سے نواب مرحوم کا راہ و رابطہ نہیں تھا لیکن ریذیڈنٹ جنرل اختر لونی سے نواب مرحوم کے تدبر و علم اور پولیٹکل خدمات اور شاہی رسوخ کا حال سن چکے تھے۔ نواب کے انتقال کی خبر سنکر معہ اسسٹنٹ ریذیڈنٹ مرحوم کے گھر میں ماتم پرسی کے لئے آئے۔ ان کے بیٹوں دامادوں پوتوں اور نواسوں کو تسلی آمیز کلمات سے اطمینان دلایا۔ اور محل سرا میں بھی تعزیت کا پیغام بھیجا۔ ریذیڈنٹ صاحبان نے بچوں کو پیار دیا۔ اور مرحوم کی وفات پر نہایت افسوس ظاہر کیا۔

دبیر الدولہ کی علم دوستی اور ان کے تلامذہ

نواب دبیر الدولہ ابتدائے عمر ہی سے فضیلت علم کے قائل تھے۔ اور اسی علم کی خاطر عین عالم شباب تک وطن سے باہر پھرتے رہے۔ تمام علوم سے علم ریاضی

کے نہایت شائق تھے۔ اور باوجود اس امارت و فارغ البالی کے صرف اپنے شوق کی خاطر چند ذہین اور منتخب طالبعلموں کو پڑھایا کرتے تھے۔ بلکہ اگر کوئی امداد اور وظیفہ کا مستحق ہوتا تو علاوہ کتابوں کے اُس کو نقدی کی امداد بھی دیا کرتے تھے اُن کے مشہور اور نامور شاگردوں میں علاوہ اُن کے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین خاں کے جو علم ہیئت۔ زائچہ۔ اور علم اور صنعت آلات رصد میں بے نظیر تھے۔ مندرجہ ذیل حضرات کا بھی خصوصیت سے نام لیا جاتا ہے۔ مولوی کرامت علی خلف مولوی حیات علی جو دلی کے بے مثل عالم تھے۔ مولوی رجب علی شیعہ جنہوں نے گورنمنٹ پنجاب کا میر منشی ہو کر نہایت عروج اور نام پیدا کیا۔ اور جن کا بہت بڑا کتب خانہ جگراؤں ضلع لدھیانہ میں اُن کے بیٹے مولوی شریف حسین صاحب کے پاس ہے۔ خواجہ محمد ناصر جان جو خواجہ میر درد کی درگاہ کے سجادہ نشین تھے۔ اور حکیم رستم علی خاں۔

دبیرالدولہ نہایت نفاست پسند تھے

نواب دبیرالدولہ کی زندگی تادم آخر نہایت شان و شوکت اور عمدگی اور عزت سے گذری۔ دلی کے تمام امرا و عمائد ان کی نہایت عزت کرتے تھے۔ اُن کی طبع میں نہایت نفاست تھی۔ اُن کا لباس اور فرش فروش آئینہ کی طرح صاف رہتے تھے۔ شام کے وقت اُن کی پُر تکلف مسند کے آگے دو سفید رنگ کے شیشے کی فانوسیں موم بتی سے روشن ہوئی رکھی رہتی تھیں۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد دبیرالدولہ کے تمام پوتے اور نواسے اپنا اپنا سبق سنانے کے لئے ان کے حکم سے اُن کے ارد گرد آ بیٹھتے تھے۔ سیرت فریدیہ میں ڈاکٹر سرسید احمد خان بہادر لکھتے ہیں۔ وہاں جانے اور بیٹھنے میں ہمیں مشکل یہ تھی۔ کہ نہایت سفید چاندنی کا فرش بچھا ہوا ہوتا تھا۔ ہم کو اپنے پاؤں نہایت صاف رکھنے پڑتے تھے۔ اس خوف سے کہ کہیں فرش پر کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔ اگر اتفاق سے ہم میں سے کسی لڑکے کے پاؤں کا دھبہ لگ جاتا تو نہایت خفا ہوتے اور کہتے کہ کتنے کی طرح پاؤں رکھتا ہے۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ اگر کسی لڑکے کے کپڑے دھبہ یا روشنائی سے خراب ہو جاتے اور وہ ڈر کے مارے کپڑے نہ بدل آتا تو وہ فوراً سمجھ جاتے اور کہتے۔ کہ کیا تو چمارو

کی طرح کپڑے پہنے ہوا تھا۔ کہ اب بدل کر آیا۔

دبیرالدولہ کا کتب خانہ

کتب بینی اور مطالعہ کا شوق خبط او جنون تک پہنچا ہوا تھا۔ کوئی نئی کتاب کسی علم اور کسی فن کی ہوتی اُسکو یا تو اپنی لائبریری کے لئے منگوا لیتے یا اُس کو ایکدفعہ ضرور دیکھ لیتے۔ اور کتب خانہ میں بھی کتاب اُس وقت تک داخل نہ کرتے جب تک اُسکو بہ نظر غور پڑھ نہ لیا کرتے۔ اُن کے کتب خانہ کی کوئی کتاب ایسی نہ تھی جس پر اُن کے ہاتھ کا کچھ لکھا ہوا حاشیہ یا نوٹ نہ ہو۔ عام لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ دبیرالدولہ انگریزی مطلق نہیں جانتے۔ لیکن سیرت فریدیہ میں لکھا ہے کہ جب اُن کے کتبخانہ کی انگریزی کتابوں پر نظر ڈالی گئی تو اُن پر بھی بہت سے حاشیے اور معنے اُن کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے پائے گئے۔ اور نیز بعض قرائن سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ مطلق اس قدر انگریزی ضرور جانتے تھے۔ جس سے بولنے اور پڑھنے کا کام نکال لیتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں لکھنؤ اور کلکتہ سے انہوں نے انگریزی زبان سیکھنے کی کوشش کی تھی۔ کیونکہ حکام انگریزی سے اُن کے تعلقات اسی زمانہ سے شروع ہوتے ہیں

دبیرالدولہ کی تصانیف

دبیرالدولہ نے بہت ضخیم کتابیں نہیں لکھیں۔ اُن کی طبیعت کا رُجحان زیادہ تر علم ہیئت اور آلات رصد اور ریاضیات کی طرف تھا۔ اور انہیں علوم میں اُنہوں نے کئی رسالے لکھے۔ جس میں سے اکثر غدر ۱۸۵۷ء میں ضائع ہوگئے۔ تین رسالے اُن کے نواسے آنریبل ڈاکٹر سرسید احمد خاں بہادر بانی مدرسۃ العلوم علیگڈھ نے کتبخانہ مدرسۃ العلوم کو دیئے ہیں۔ جو چھپ گئے ہیں۔ اور جن کے نام یہ ہیں ۱۔ صنعت اصطرلاب ۲۔ صنعت پرکار متناسبہ ۳۔ اعمال پرکار متناسبہ۔

دبیرالدولہ کی مجلس

تمام روسا اُمرا اور شرفائے دہلی نواب دبیر الدولہ کے ادب و احترام میں اُن کا
مرتبہ رسُوخ اقتدار - اُن کی تبحر علمی اور اُن کے رعب داب کو مدِ نظر رکھا کرتے تھے -
اور اسی لئے نواب دبیر الدولہ کی مجلس ایسی مؤدب اور شائستہ ہوتی تھی - کہ جس سے
ایک شان اور عظمت ظاہر ہوتی تھی - اور متانت اور خاموشی در و دیوار سے برس ہی
تھی - ان کی مجلس مجالس العلما اور محافل شرفا کا ایک نمونہ تھی - کسی علمی مسئلہ یا بعض
دفعہ مسائل تصوف کے سوا بہت کم باتیں اُن کی بزم میں ہوتی تھیں - بخشی الممالک
بخشی محمود خاں شاہی ظریف اور خوش طبع تھے - اور مثل ہزار داستان کے ہر وقت
چہکتے رہتے تھے - کوئی شخص اُن کی زد سے نہ بچ سکتا تھا - لیکن یہ خوش مزاج اور
ظریف شخص جب دبیر الدولہ کی مجلس میں آتا - تو نہایت مودب ہو کر بیٹھتا - اور کہتا
میری جراءت نہیں کہ اس نورانی صورت کی مجلس میں کوئی بات ایسی کروں جو خلاف
داب مجلس ہو - مگر دبیر الدولہ کے بیٹوں کے ساتھ بخشی محمود خاں کی ملاقات بے تکلفانہ
اور دوستانہ تھی

نواب دبیر الدولہ کا صبح کا کھانا

رات کا کھانا باہر دیوان خانہ میں کھاتے تھے - اور دسترخوان پر دس بارہ
آدمی ضرور موجود رہتے تھے - لیکن صبح کا کھانا آپ ہمیشہ محل سرا میں کھایا کرتے
تھے - ایک بہت بڑا دسترخوان بچھا دیا جاتا تھا - اور کل بیٹے بیٹیاں پوتے پوتیاں
نواسے نواسیاں بیٹوں کی بیویاں اور دیگر چھوٹے بڑے رشتہ دار سب ایک
ہی دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے - اللہ اکبر کیسا خوش نصیب خاندان تھا - جس
کا سب سے بڑا بزرگ اُن کے سر پر موجود تھا - اور کیسا خوش نصیب تھا وہ شخص
جس کی اتنی بڑی اولاد اس کی زندگی میں موجود تھی - چھوٹے بچوں کے آگے جن میں
سید احمد خاں مرحوم بھی شامل ہوا کرتے تھے - خالی رکابیاں رکھ دی جاتی تھیں
اور اُن سے پوچھا جاتا تھا - کہ تم کونسی چیز کھاؤ گے جو چیز وہ بتاتے سفید ریش بزرگ
اپنے برکت والے ہاتھوں سے وہی چیز چمچہ میں رکھکر بقدر مناسب بچوں کو دیتے -
نعمت خانے میں باوجودیکہ بڑے لوگوں کے ساتھ بچے بھی ہوا کرتے تھے - مگر شور و غل

کا نام نہیں ہوتا تھا ۔ نہایت ادب اور صفائی اور خاموشی سے کھانا کھایا جاتا تھا ۔ نہ کپڑے خراب ہوتے تھے ۔ نہ کھانا گرتا تھا ۔ اور نہ ہاتھ بے ترتیبی سے بھرے جاتے تھے ۔ اور نہ لڑکے کوئی شرارت کرنے پاتے تھے ۔ غرض یہ گھر ادب و تہذیب اور شائستگی کا مخزن تھا ۔

دبیرالدولہ کی ناراضگی کا لفظ

کشمیر میں جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے ۔ اسلام کی ابتدا صوفیوں اور پیروں اور بزرگان سادات کے ذریعہ ہوئی ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ کشمیر میں پیر پرستی کا بڑا چرچا ہے ۔ جس کا کوئی پیر نہ ہو اس کو بہت برا سمجھا جاتا ہے ۔ اور "بے پیر" کا لفظ اس کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ۔ اور بے پیر ایک بہت بڑی گالی سمجھی جاتی ہے ۔ دبیرالدولہ بھی کشمیری ہونے کی وجہ سے جب کسی پر بہت ناراض ہوتے تو یہی گالی دیا کرتے تھے ۔ چنانچہ جب کوئی لڑکا اپنا سبق اچھی طرح سنا دیتا ۔ تو اس کو مٹھائی یا دیگر چیزیں بطور انعام دی جاتی تھیں ۔ اور جس کو سبق نہ آتا اس کو نہ صرف انعام سے ہی محروم رکھا جاتا بلکہ اس کو جھڑک دیتے ۔ اور جب نہایت خفا ہوتے تو بے پیر کہدیتے ۔ یہ لفظ علاوہ بچوں کے عام لوگوں پر بھی ناراضگی کے عالم میں کہا کرتے تھے ۔ چنانچہ سرسید خود لکھتے ہیں کہ میں ایکدفعہ حسب دستور بوستان کا سبق سنا رہا تھا ۔ اس میں یہ شعر بھی تھا ؎

طمع را سہ حرف است و ہر سہ تہی   وزاں نیست مرطامعاں را بہی

میں نے پہلے مصرع کا ترجمہ کیا طمع کے تین حرف تینوں خالی کہا ۔ ہونہہ میں سمجھا شائد ترجمہ غلط کیا ہے ۔ لیکن جب سوچا تو پھر وہی معنے نکلے ۔ آخر خفا ہوئے اور کہا ۔ "بے پیر سبق یاد نہیں کرتا" سرسید کہتے ہیں اس فقرے کے سوا انہوں نے مجھے نہ کچھ بتایا اور نہ کچھ کہا ۔ جسقدر مجھ کو رنج ہوا ۔ اور برابر آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے وہ اب تک مجھکو یاد ہے ۔ بہت دیر کے بعد یہ راز نہ کھلا کہ مصرع کے لفظی معنے نہیں کئے تھے ۔ اور "است" کا لفظ میں بالکل کھا گیا تھا ۔

دبیرالدولہ صوفی مشرب تھے

دبیرالدولہ اور اُن کے خاندان کو پیروں فقیروں اور حضرات صُوفیاء سے نسبت خاص تھی۔ اُن کے ایک بھائی خواجہ نجیب الدین بہت بڑے بزرگ اسی سلسلہ میں تھے۔ دبیرالدولہ بھی رسول شاہیوں کے نام لیوا تھے۔ اور کسی زمانہ میں پیر مُکا شاہ رسول شاہی کے مُرید ہوگئے تھے۔ لیکن اُن کی طبیعت چونکہ تحقیقات علوم وفنون سے زیادہ مناسبت رکھتی تھی۔ اور اللہ تعالےٰ نے ان کو ایک جلیل القدر اور نامور مدبر بنانا تھا۔ اس لئے وہ فقیری کیطرف زیادہ توجہ نہ کر سکے۔ البتہ مسائل تصوف پر اکثر بحث کیا کرتے تھے۔

دبیرالدولہ فرقۂ رسول شاہیوں میں عملی طور پر

اکثر رسول شاہی فقیر اپنے سلسلہ میں داخل ہوتے ہی داڑھی مونچھ کا صفایا کر دیتے تھے۔ اور تجرد کو پسند کر لیتے تھے۔ لیکن رسول شاہی بزرگوں کی طرف سے کوئی خاص جبر نہ تھا۔ کہ جو ان کی عقیدت و ارادت اور حلقہ بگوشی میں آئے وہ گھر بار کو بھی ترک کر دے۔ اور داڑھی مونچھ کو بھی منڈوا دے۔ ایسے ہی لوگوں میں دبیرالدولہ بھی تھے۔ جو مُرید تو رسول شاہیوں کے تھے۔ لیکن پورے دنیادار تھے اور دنیاداروں کی حیثیت ہی میں زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ اسّی سال کی عمر میں یعنی مرنے سے دو سال قبل خیال آیا۔ کہ ساری عمر میں مُرشد کے طریقہ میں قدم نہیں رکھا۔ ایکدفعہ تو اُنکی روح کو خوش کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ خیال آتے ہی حجام کے بُلانے کا حکم دیا۔ وہ حاضر ہوا۔ فرمایا کہ داڑھی مونچھوں کا صفایا بولدو۔ وہ بے چارا حیران کہ یہ نورانی صورت یہ لمبی سفید داڑھی۔ وہ خاموش ہو رہا۔ آپ خفا ہوئے اور کہا بے پیر کہتا نہیں مانتا۔ جلدی کر۔ اُس نے ایک دم میں داڑھی مونچھ کو القط کر دیا۔ شہر میں ایک بڑا چرچا ہوا۔ گھر گھر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ اور تو اور گھر کے لوگ حیران تھے۔ لیکن اُنکو خبر اُس وقت ہوئی۔ جب وہ بزرگ داڑھی اور شرعی مونچھیں خاک میں مل رہی تھیں۔ لوگوں نے طرح طرح کے آوازے

کسے۔ کہ دبیر الدولہ "سترا بہترا" ہوگیا ہے۔ ہوش حواس ٹھکانے نہیں ہیں۔
غرض کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔ لیکن اُنہوں نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ ایک دفعہ کے
سوا پھر اُنہوں نے کبھی داڑھی مونچھ کو نہیں منڈوایا۔ انتقال کے وقت اُن کی
داڑھی خاصی لمبی ہوگئی تھی۔

دبیر الدولہ کی ملازم پروری

نواب دبیر الدولہ کا ایک نہایت قدیم ملازم لالہ ملوک چند تھا۔ جس کو آپ نے
سب پرائیویٹ کاروبار سپرد کیا ہوا تھا۔ بلکہ اُس کو اپنا دیوان کل مقرر کر دیا تھا۔ اور
اسی لئے ملوک چند نہایت دیانتدار۔ وفا شعار۔ فہمیدہ و ور خدمتگذار ملازم تھا۔ نواب
دبیر الدولہ نہایت بارعب تھے۔ اُن کے مزاج پر کوئی شخص غالب نہ آ سکتا تھا۔
لیکن اگر کسی کو کچھ تھوڑا بہت اُن کے مزاج میں دخل تھا۔ تو وہ یہی دیوان ملوک چند
تھا۔ دیوان ملوک چند کی وفا شعاری اور شرافت نسبی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی
کہ اُن کے بیٹوں کو نواب ممدوح کی وساطت سے ہر چند نہایت عروج ہو گیا تھا۔
اور بہت بڑے دولتمندوں میں اُن کا شمار تھا۔ لیکن دیوان ملوک چند نے باوجود
اس عروج و تمول کے نواب صاحب کے حین حیات تک اُن کی ملازمت نہ چھوڑی
بلکہ ان کے بیٹے نواب زین العابدین خاں کے بھی اُس وقت تک ملازم رہے جب
تک اُن کی زندگی نے اُن کا ساتھ دیا۔ نواب صاحب نے بھی اپنے نمک خوار اور
قدیم ملازم کی وہ قدردانی کی اور ایک ایسی نظیر قائم کی کہ جو آج تک لاثانی چلی آتی ہے
یعنی نواب دبیر الدولہ نے جب اپنی جائیداد کو تقسیم کیا۔ تو جس قدر حصہ اس میں
سے اوروں کو دیا اُسی قدر اپنے اس قدیم مگر شریف الاصل ملازم کو بھی دیا۔

نواب وحید الدین احمد خاں

بڑے بیٹے کا نام خواجہ وحید الدین احمد تھا۔ جس پر نواب ممتاز محل بیگم نہایت
مہربان تھیں۔ اور اس مہربانی کی ایک وجہ خاص یہ تھی۔ کہ جب ۱۸۲۱ء مطابق
۱۲۳۶ھ میں شہزادہ مرزا جہانگیر نے الٰہ آباد میں بحالت قید انتقال کیا۔ اُس

زمانہ میں خواجہ فریدالدین احمد وزارت کا کام کرتے تھے - ان کے ایما سے ان کے بڑے بیٹے نواب وحیدالدین احمد خاں شہزادہ کی لاش لانے کے لئے الہ آباد گئے - اور خسرو باغ سے (جہاں پہلے لاش دفن کی گئی تھی) لاش کو دہلی میں لائے - ممتاز محل کو بیٹے سے بڑی محبت تھی - اور وہی محبت اب اُنہوں نے وحیدالدین احمد خاں پر منتقل کردی - کیونکہ وہ نہائیت اعزاز اور کمال احتیاط سے اُن کی لاش لائے تھے - بلکہ بادشاہ بیگم اکثر فرمایا کرتی تھیں - کہ میں وحیدالدین خاں کو مرزا جہانگیر کے برابر سمجھتی ہوں - مرزا جہانگیر کا ایک چھوٹا سا لڑکا تھا تیمور شاہ نام - بادشاہ بیگم نے مرحوم بیٹے کی بجائے اپنے پوتے تیمور شاہ کی سرکار قائم کی - اُس کے کل اختیارات وحیدالدین احمد کو عطا ہوئے - اور بادشاہ کی طرف سے نواب مختارالدولہ کا خطاب ملا - اس واقعہ کے بعد نواب دبیرالدولہ نے وزارت سے استیعفا دیدیا لوگوں کا خیال تھا - کہ نواب مختارالدولہ کا عروج بھی اب ختم ہوگیا - لیکن جو عروج اور رسوخ ابتدا سے مختارالدولہ کو حاصل تھا - وہ نواب ممتاز محل بیگم کی زندگی تک برابر قائم رہا - بلکہ اُن کی وفات کے سال ڈیڑھ سال بعد تک بھی آپ سرکار تیمور شاہ میں مختار کل تھے - نواب علی نقی خاں کے عہد وزارت میں جب دیکھا کہ وہ پہلی بات اب نظر نہیں آتی - تو ناراض ہوکر لکھنؤ چلے گئے - وہاں بھی جب تک رہے با اقتدار رہے - لیکن دل نہ لگا - اور واپس چلے آئے - غدر ۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں نے دہلی کو فتح کرلیا - آپ اُس وقت نہائیت ضعیف تھے - چیلون کے کوچہ میں بعض اہل شہر نے انگریزوں سے فساد پیدا کیا - سپاہی لوگوں کے مکانوں میں گھس آئے - نواب مختارالدولہ کے مکان کا ایک دروازہ اسی کوچہ کی طرف تھا - چند سپاہی شمشیر بکف وہاں بھی آگئے - آپ اُس وقت نماز عصر پڑھ رہے تھے - ایک شقی القلب نے عین حالت نماز میں آپ کو شہید کردیا -

نواب زین العابدین احمد خاں

چھوٹے بیٹے کا نام خواجہ زین العابدین احمد تھا - اُن کی زندگی نہائیت شان و شوکت اور امیرانہ چوچلوں کے ساتھ بسر ہوئی ہے - نواب دبیرالدولہ کی موجودگی

اور اُن کی وفات کے بعد بھی اُنہوں نے کسی شاہی خطاب یا سرکاری عُہدہ کے حاصل کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ لیکن ۱۸۴۶ء مطابق ۱۲۶۳ھ میں ابوظفر بہادر شاہ نے ان کے والد مرحوم کے تمام خطابات" نواب دبیر الدولہ مصلح جنگ" خواجہ زین العابدین احمد خاں بہادر" ان کو عطا کئے۔

آپ اپنے باپ کے قابل بیٹے اور لائق شاگرد تھے۔ علم ہیئت اور ریاضیات میں آپ ماہر و کامل تھے۔ ایجاد کا مادہ بھی آپ میں تھا۔ آپ کو شباب ہی سے گانے اور بین بجانے کا شوق پیدا ہوا۔ اور یہ شوق آخر عمر تک رہا۔ بین کو اپنے ہاتھ سے بناتے اور اس کے تونبوں اور ٹھاٹھ میں ایسی ایجادیں کرتے تھے کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ سیرت فریدیہ میں لکھا ہے۔ کہ یہ ایک ایسی ایجاد تھی کہ اگر اس کا موجد یورپ میں ہوتا تو اُس کے کمال سے ایک عالم واقف ہو جاتا۔

میر ناصر احمد جو صحیح النسب سید تھے۔ بین بجانے میں کمال رکھتے تھے۔ ایسے ایسے نامی گویے۔ دہرپت اور خیال گانے والے ان کی سرکار میں نوکر تھے۔ اور زندگی عیش وعشرت سے گذرتی تھی۔ خواجہ میر درد علیہ رحمت کی درگاہ پر ہر مہینے کی چوبیسویں کو صوفیوں اور درویشوں کا جلسہ ہوا کرتا تھا جس میں نواب زین العابدین خاں میر ناصر احمد کو ساتھ لیکر وہاں جاتے تھے۔ رائے پران کشن دہلی کے ایک معزز رئیس تھے۔ اُنہوں نے ایک طوائف بی جنّا گھر میں ڈال رکھی تھی۔ اُس کی خاطر سے ہر مہینے کی سترھویں کو گانے بجانے کا جلسہ ہوا کرتا تھا۔ بڑے بڑے گویے اپنا کمال دکھانے آتے تھے۔ سب سے پہلے بی جنّا خود دہرپت و خیال گاتی تھی۔ اُس کے بعد اور لوگ گاتے تھے۔ نواب زین العابدین خاں نے اس جلسہ میں بھی کبھی ناغہ نہیں کیا۔

صرف دہرپت اور خیال کا ہی شوق نہیں تھا۔ جس طرف توجہ کی اُس کو کمال تک پہنچا دیا۔ جب علم ریاضی کی طرف مائل ہوئے۔ تو بجز آلات رصد اور علوم ریاضی کی کتابوں کے اور کسی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ اپنے قابل باپ کی طرح اکثر آلات رصد اپنے ہاتھ سے بنایا کرتے تھے۔ اور بعض تو ایسے عمدہ ہوتے تھے کہ پتنگ ساز اور پتنگ باز حیران رہ جاتے تھے۔ پتنگ کے کام میں اس

غور و خوص سے کام لیا - کہ اس معمولی کھیل کو ایک علمی کھیل بنا دیا۔ صنعت پتنگ کے نام سے ایک رسالہ لکھا - جس میں اقلیدس کی طرح شکلیں بنائیں اور اُن کی نسبتیں قائم کیں - اور اُن کی خاصیتیں لکھکر یہ بتایا کہ فلاں قسم اور فلاں شکل کا پتنگ اتنی دُور تک جائیگا - اور ایسی ایسی حرکات کریگا - یہ رسالہ اگر چھپ جاتا تو آج پتنگ بازی ایک علمی مشغلہ ہوتا - اور پتنگ کے فن میں ایک انقلاب عظیم واقعہ ہو جاتا۔ لیکن ملک کی بدقسمتی سے غدر کے ہولناک واقعہ نے جہاں ہزار ہا قیمتی انسانی جانیں ضایع کیں وہاں علوم و فنون کو بھی اسقدر صدمہ پہنچایا - کہ بیش بہا خزانے تباہ کر دیئے - یہ رسالہ بھی جو ہر چند مختصر تھا - لیکن نہایت قیمتی تھا غدر میں ضایع ہو گیا -

تیراندازی کا شوق ہوا - تو چاروں طرف تیروں اور کمانوں کے ڈھیر لگے رہتے تھے - بڑے بڑے تیرانداز مقابلہ میں آتے ہوئے دم چُراتے تھے - ہر روز سہ پہر کو تیراندازی کا جلسہ ہوتا تھا - جس میں خوب خوب نشانے اڑتے تھے - یہ فن آپ نے اپنے بھانجے سید احمد خاں (بانیٔ علی گڈھ کالج) کے والد سید محمد متقی خاں سے سیکھا - جو فن تیراندازی میں بے نظیر اُستاد تھے - آپ نہ صرف تیر چلانا ہی سیکھے - بلکہ اپنے ہاتھ سے تیر اور کمانیں بناتے تھے - اُس زمانہ میں اُن کے وطن قدیم کشمیر کے تیر کمان بہت مشہور تھے - لیکن واقف کاروں اور تیراندازوں کا بیان ہے - کہ نواب زین العابدین خاں کی کمانیں کشمیر کی کمانوں سے عمدہ ہوتی تھیں - بعض اشخاص کو محض اپنے شوق اور تفریح طبع کے لئے اپنے پاس سے تیراندازی کا سامان دیتے تھے - چنانچہ ایک شخص میر الااللہ [1] جو بہت ظریف تھے - اور تیراندازی محض لوگوں کو خوش کرنے کے لئے ہی کرتے تھے - اور جس کا تیر غالباً ساری عمر میں بھی بہ ہدف نہیں ہو سکا - وہ تیرانداز کا سب سامان نواب زین العابدین خاں کی سرکار سے پاتے تھے - اسی طرح ایک ہندو مرصع ساز تھے - وہ تیر لگاتے وقت "اللہ غنی" کہتے تھے - اُن کا نام بھی اللہ غنی پڑ گیا تھا - غرض ان کی زندگی عجب بے فکری عجب مشغلوں اور عجیب عجیب

[1] یہ پیر مرد چونکہ تیر لگاتے وقت الا اللہ کا نعرہ لگایا کرتے تھے اسلئے نام میر الا اللہ ہی پڑ گیا -

اور عہد [illegible] میں گذری۔

عمر کے آخری حصے میں کسی چیز سے کوئی شوق نہ رہا تھا اپنے والد کی طرح چند ذہین اور ہونہار لڑکوں اور بالخصوص اپنے بیٹے خواجہ ہاشم علی خاں کو علوم ریاضیات کے سبق پڑھایا کرتے تھے۔ خواجہ ہاشم علی خاں بھی اپنے باپ اور دادا کی طرح کشمیری دماغ اور کشمیری ذہانت کا ایک روشن نمونہ تھے۔ آخر غدر سے چند مہینے پیشتر یعنی ۲۲ اکتوبر ۱۸۵۶ء مطابق ۱۲۷۳ھ کو آپ نے انتقال فرمایا

نواب دبیر الدولہ کی موجودہ اولاد

سیرت فریدیہ سے نواب دبیر الدولہ کی اولاد کا پتہ خواجہ ہاشم علی خاں تک ملتا ہے جن کی رحلت کو آج (۱۹۱۱ء) تک باون سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ میں نے دہلی میں بعض احباب کو خطوط لکھے کہ اگر نواب دبیر الدولہ کی اولاد سے کوئی صاحب موجود ہوں۔ تو ان کے اسمائے گرامی سے اطلاع دیں۔ راقم الحروف مولوی محمد عطاء اللہ صاحب خلف خان بہادر شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب مرحوم کا شکر گذار ہے کہ انہوں نے ازراہ نوازش بہت جلد کیفیت سے اطلاع دی چنانچہ اُن کے خط مورخہ یکم ستمبر ۱۹۱۱ء کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

دوسری بات جو آپ نے دریافت فرمائی ہے۔ اُس کا جواب اُن کے ایک نہایت نزدیک کے رشتہ دار سے تحریر کرا کر روانہ کرتا ہوں۔ اس سے زیادہ درست اور صحیح اور قابل صحت کوئی دوسرا نہیں بیان کر سکتا ہے۔

نواب زین العابدین احمد خاں (پسر نواب دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد) کے چار بیٹے تھے۔ سب سے بڑے خواجہ حاتم علی خاں اُن کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اُن سے چھوٹے خواجہ ہاشم علی خاں تھے۔ وہ غدر میں شہید ہو گئے۔ اُن کا ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں سہ سہ کا انتقال ہو گیا۔ لڑکے کا ایک لڑکا یعنی ہاشم علی خاں کا ایک پوتا تھا۔ اُس کا بھی انتقال ہو گیا۔ ہاشم علی خاں سے چھوٹے نواب خواجہ قاسم علی خاں عرف نواب خواجہ شرف الدین احمد خاں تھے۔ اُن کے اس وقت دو لڑکے موجود ہیں۔ [illegible] صاحب مرحوم کی سوا سے ان دو بھتیجوں کے اور کوئی اولاد [illegible]

زینہ دہلی میں موجود نہیں۔ فقط اور یہ ہر دو صاحب چیلوں کے کوچہ میں رہتے ہیں۔ بڑے صاحبزادہ کا نام خواجہ فخرالدین احمد اور چھوٹے کا نام خواجہ مصلح الدین احمد ہے۔ صاحب اول الذکر کی عمر پچاس سال اور مؤخرالذکر کی ۴۸ سال ہے۔



عزیزالنسا بیگم

ایک کشمیری خاتون کے علمی اور ملکی کارنامے

بلا شبہ ایک اچھی ماں ہزار استادوں سے بہتر ہے (مسیح)

سرسید احمد خاں بہادر کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں اعلےٰ تعلیم کی اشاعت کیجائے لیکن اس کے علاوہ اُن میں دو تین اور باتیں نہایت ممتاز طور پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً اُنکے پولیٹکل خیالات اس بارہ میں اُنکی بڑی کوشش یہ تھی کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں جو ایک قسم کی منافرت پیدا ہوگئی تھی اُسے مٹایا جائے اور ان میں عمدہ تعلقات پیدا کئے جائیں۔ دوسرے انگریزی سلطنت کی خیر خواہی اور وفاداری اور اس حکومت کی خوبیاں لوگوں کے دلوں پر نقش کی جائیں۔ دوسری ممتاز بات جو ان میں پائی جاتی تھی۔ اور جسکی وجہ سے تمام ملک میں ایک تہلکہ پڑ گیا۔ اور لوگوں نے بڑے زور شور سے مخالفت کی وہ ان کے مذہبی خیالات تھے۔ اگرچہ ان خیالات کے کیسے ہی مخالف کیوں نہ ہوں لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ ملک پر ان کا بہت کچھ اثر پڑا اور ٹھیٹ اسلام اور توہمات باطلہ جھوٹی سچی قصے کہانیوں میں لوگ فرق کرنے لگے۔ عام طور پر تحقیق کا خیال پیدا ہوگیا۔ تیسری بات جو فی الحقیقت نہائیت قابل تعریف و تحسین ہے وہ ان کے پاکیزہ اخلاق ہیں۔ میں یہاں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ وہ ان تینوں باتوں میں اپنی ماں کے سچے شاگرد تھے۔ اور اس بارہ میں ان کی زندگی پر زیادہ بلکہ بالکل اُن کی والدہ کا اثر پڑا۔

۱۸۸۲ء میں ہندوستان کی تعلیمی حالت کی تحقیقات کے لئے ایک ایجوکیشن کمیشن قایم کیا گیا۔ سرسید احمد خاں بہادر اور سید محمود بھی اس کے ممبر تھے۔ سید احمد خاں سے جب تعلیم نسواں کی نسبت سوال کیا گیا۔ تو اُنہوں نے اثنائے شہادت میں یہ بھی بیان فرمایا۔ کہ "خود میں نے فارسی کی ابتدائی تعلیم

اپنی ماں سے پائی - اور نیز اوائل عمر میں مجھے بہت سے مفید اور اخلاقی سبق میری والدہ نے دیئے جو اب تک بعینہٖ مجھے یاد ہیں"۔

عزیز النساء بیگم (والدہ سرسید احمد خاں) خواجہ فریدالدین احمد کی سب سے بڑی بیٹی تھیں - اگرچہ صرف قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں - لیکن نہائیت لائق منتظم - ذہین - رحمدل با اخلاق اور قدرتی طور پہ نہائیت عالی دماغ واقع ہوئی تھیں - جن کی قابلیت اور خوبی کا اثر نہ صرف سرسید احمد خاں بہادر پر بلکہ قریب قریب تمام خاندان پر پڑا - سرسید احمد خاں اپنی ابتدائی تعلیم کا جو انہوں نے اپنی والدہ سے حاصل کی - اس طرح ذکر کرتے ہیں - میں نے خود گلستان کے سبق اُن سے پڑھے ہیں - اور ابتدائی فارسی کتابوں کے سبق انکو سناتے ہیں - مجھکو خوب یاد ہے - کہ جب میں انکو سبق سناتا یا نئے سبق کا مطالعہ ان کے پاس بیٹھکر دیکھتا تو وہ سوت کی گوندھی ہوئی تین لڑیں ایک لکڑی میں بندھی ہوئی میری تنبیہ کو اپنے پاس رکھ لیتی تھیں - اگرچہ وہ خفا تو کئی بار ہوئی ہونگی مگر اُن سوت کی لڑیوں سے مجھے کبھی نہیں پیٹا

ایک دفعہ کا ذکر ہے - کہ ایک شخص نے سرسید احمد خاں بہادر سے بدی کی جن سے انہوں نے کبھی بہت اچھا سلوک کیا تھا - اتفاق سے وہ تمام ثبوت جس سے پوری سزا عدالت سے ملسکتی تھی - اُن کے ہاتھ آ گئے - اور سرسید انتقام لینے پر آمادہ ہو گئے - اُن کی والدہ نے جب یہ سُنا تو کہا اگر تم اسکو معاف کر دو تو اس سے عمدہ کوئی کام نہیں - اور اگر تمکو اس کی بدی کی حاکم سے سزا دلوانی ہے تو نہائیت نادانی ہے - کہ اُس قوی اور زبردست احکم الحاکمین کے چنگل سے جو ہر ایک اعمال کی سزا دینے والا ہے چھوڑ کر دنیا کے ضعیف اور ناتواں حاکموں کے ہاتھ ڈالنا چاہتے ہو - سرسید کہتے ہیں کہ اس نصیحت کا میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ اُسوقت سے میرے دل میں کبھی کسی شخص سے انتقام لینے کا خیال نہیں آیا - اگرچہ اُس شخص نے میرے ساتھ کیسی ہی دشمنی کیوں نہ کی ہو - بلکہ میرے دل میں یہ بات پیدا ہو گئی کہ اب میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا بھی میرا اُس سے بدلہ لے -

سرسید نے اسی قسم کے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے ... وہ یہ ہے - کہ جس

زمانہ میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی۔ میں نے ایک نوکر کو جو بہت بڈھا اور پُرانا تھا۔ کسی بات پر تھپڑ مارا۔ جس وقت میری والدہ کو خبر ہوئی۔ اور تھوڑی دیر بعد میں گھر میں گیا تو میری والدہ نے ناراض ہو کر کہا کہ اسکو گھر سے نکال دو۔ جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے۔ یہ گھر میں رہنے کے قابل نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور باہر سڑک پر چھوڑ دیا۔ اُسی وقت ایک دوسری ماما میری خالہ کے گھر سے جو قریب تھا نکلی۔ اور مجھ کو میری خالہ کے گھر لیگئی۔ میری خالہ نے کہا کہ دیکھو تمہاری والدہ تم سے کسقدر ناراض ہیں۔ اور اس سبب سے جو تم کو گھر میں رکھیگا اس سے بھی خفا ہونگی۔ مگر تم کو میں چھپائے رکھتی ہوں۔ اور کوٹھے پر کے ایک مکان میں مجھے چھپا دیا۔ تین دن تک میں اُس کوٹھے میں چھپا رہا۔ میری خالہ میرے سامنے نوکروں اور میری بہنوں سے کہتی تھیں کہ "دیکھنا آپا جی کو خبر نہ ہو کہ یہاں چھپے ہوئے ہیں" تین دن کے بعد میری خالہ میری والدہ کے پاس قصور معاف کرانے کے واسطے لے گئیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر اُس نوکر سے قصور معاف کرائے تو میں معاف کرونگی۔ وہ نوکر ڈیوڑھی پر بلایا گیا۔ میں نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑے۔ جب تقصیر معاف ہوئی جس ماں کی یہ تعلیم ہو اُس کا بچہ کیسا کچھ با اخلاق نہ ہوگا۔

سر سید اپنے ایک دوست سے ہمیشہ ملنے جایا کرتے تھے۔ لیکن اتفاق سے وہ دوست ناراض ہو گئے۔ اور اُنہوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ مگر سید بدستور ملتے رہے۔ لیکن ایک مدت بعد انہوں نے بھی جانا چھوڑ دیا۔ جب اُن کی والدہ کو خبر ہوئی تو اُنہوں نے سبب دریافت کیا۔ سر سید صاحب نے جو بات تھی کہی تب انہوں نے کہا "کہ نہایت افسوس ہے۔ کہ جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے وہی بات تم بھی کرتے ہو۔ جب دوستی ہے۔ تو اُسے پورا کرنا چاہئے۔ یہ تمہارا فرض ہے اور اس دوستی کا پورا برتاؤ کرنا اُسکا فرض ہے۔ تم دوسرے شخص کے فرض ادا کرنے کے کیوں ذمہ وار ہوتے ہو۔ تم کو بدستور اپنا فرض ادا کرنا چاہئے۔ اس سے تم کو کیا کہ دوسرا بھی اپنا فرض ادا کرتا ہے یا نہیں۔

وہ غریب اور مسکین عورتوں کی ہمیشہ خبرگیری کرتی تھیں اور مکان کا ایک حصہ

اُن ہی کے رہنے سہنے اور علاج کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک غریب
لاوارث بڑھیا زیبن تھی۔ جو مرتے دم تک ان کے ساتھ رہی۔ اتفاق سے وہ
اور زیبن ایک ہی زمانہ میں بیمار ہو گئیں۔ جو دوا حکیم اُن کے لئے تجویز کرتا تھا۔ وہی
دوا زیبن کو پلاتی تھیں۔ دونوں کو صحت ہو گئی۔ اس کے بعد حکیم نے ایک قیمتی معجون
تجویز کی جو سید صاحب تیار کرا کر لائے۔ چونکہ انہیں یقین تھا کہ زیبن کو یہ قیمتی
معجون کوئی تیار کر کے نہیں دیگا۔ وہ خفیہ خفیہ زیبن کو کھلاتی رہیں۔ اور خود چکھی
تک نہیں۔ اس سے زیبن کی صحت میں بہت کچھ ترقی ہوئی۔ اور ساتھ ہی ان کی
صحت بھی اچھی ہو گئی۔ چند روز بعد جب سید صاحب نے کہا کہ اس معجون نے تو
آپ کو بہت فائدہ کیا۔ تو انہوں نے مسکرا کر کہا۔ کیا تمہارے نزدیک خدا اپنے بندوں
کو صحت نہیں دیتا۔ [illegible] سید صاحب یہ سنکر [illegible] اور پھر [illegible] معلوم ہوا۔

ایک امر اُن سے حقیقت میں نہایت استقلال کا ظہور میں آیا۔ وہ یہ ہے
کہ اُن کے بڑے بیٹے یعنی سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں کا انتقال
عین جوانی میں ہو گیا۔ اس وقت اُن کی عمر ۳۲ سال کی ہوگی۔ جیسا کچھ انہیں رنج
ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ سب لوگ [illegible] اُن کی آنکھوں
سے بے اختیار آنسو بہتے تھے۔ اور زبان سے صرف یہ الفاظ نکلتے تھے۔ خدا کی
مرضی۔ لیکن بڑا کام جو انہوں نے کیا وہ یہ تھا۔ کہ اتفاق سے اُن ہی دنوں میں
قریب کے عزیزوں کی ایک بیٹی کی شادی تھی۔ سامان شادی سب ہو چکا تھا۔
تاریخ بھی مقرر ہو چکی تھی۔ جب یہ موت واقع ہوئی۔ اس لئے حسب دستور اُن لوگوں نے
اس شادی کو ملتوی کرنا چاہا۔ مگر سید احمد خاں کی والدہ اس انتقال کے تیسرے
روز اُن کے گھر گئیں۔ اور کہا ہمارے مذہب میں تین دن سے زیادہ ماتم
کرنا منع ہے۔ جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ تم شادی ہرگز ملتوی نہ کرو۔ اور جب میں تمہیں
اجازت دیتی ہوں تو پھر نہیں کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ ایک روشن خیال عورت کا یہ کام
نہایت جرأت انگیز اور قابل تحسین ہے۔ درحقیقت ملک کی ترقی اور بہبودی کیلئے ایسی
ماؤں کی بے انتہا ضرورت ہے۔

دوسرا امر جس میں سر سید احمد خاں کو میں نے خاص طور پر ممتاز سمجھا ہے۔

وہ اُن کے مذہبی خیالات ہیں - اس سے بحث نہیں کہ وہ کہاں تک صحیح اور کس
حد تک غلط ہیں - لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے اس بارہ میں مذہبی تحقیقات
اور شک کی ایک نئی تحریک لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی - میرا خیال ہے - کہ سر سید
کے کیریکٹر کے اُس پہلو پر بھی اُنکی والدہ کا بہت اثر پڑا - اور اس میں کچھ کلام نہیں
کہ توہمات اور تعصبات (جن کے سید صاحب سخت دشمن تھے) کی بیخ و بنیاد ان کی
والدہ نے ابتدا ہی میں اُنکے دل سے اکھاڑ دی تھی۔

وہ کبھی کسی مقصد کے لئے منت یا نیاز نہیں مانتی تھیں اور نہ انہیں فال
استخارہ یا گنڈے تعویذ پر ذرا اعتقاد تھا - ستاروں اور دنوں کی سعادت یا نحوست
کی وہ ذرا برابر پروا نہیں کرتی تھیں - انہیں خدا پر پورا بھروسہ تھا - اور اس قسم
کے امور کو خلاف شرع سمجھتی تھیں - اُن کا یہ اعتقاد تھا - کہ ہر بات کے لئے
صرف خدا سے دعا کرنا چاہیے - وہی جو چاہیگا کریگا - چنانچہ ایک واقعہ جس کا
سید صاحب نے ذکر کیا ہے - اُن کے اس اعتقاد کی شہادت دیتا ہے - وہ
فرماتے ہیں [illegible] میرے [illegible] مبتلا تھے - (سید صاحب
کے ننھیال والے شاہ عبد العزیز صاحب [illegible] اور ان کے خاندان سے بہت عقیدت
رکھتے تھے) اور شاہ عبد العزیز [illegible] ہوتا تھا اس پر اعتقاد رکھتے تھے - شاہ
عبد العزیز اور ان کے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو [illegible] بیماریوں سے محفوظ رہنے
[illegible] تعویذ ہوتا تھا - اور اس تعویذ
[illegible] خون سے لکھا جاتا تھا -
اور جس لڑکے [illegible] مرغی کھانے کا اسکو امتناع
[illegible] ان کی ننھیال والوں نے
[illegible] سبب سے انڈا یا مرغی
[illegible] ایمان رکھنے کے برخلاف
ہے - وہ ان دونوں لڑکوں کو جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھاتے اور کوئی ایسی چیز
بھی موجود ہوتی جس میں انڈا پڑا ہو یا مرغی کا سالن یا مرغ پلاؤ ہوتا تو بے تامل
اُن کو کھلا دیتیں وہ لڑکے چراتے اور انڈا پسند کرتے تھے - وہ بے تامل اُن کو

پکوا کر کھلا دیتی تھیں"۔

سید صاحب کہتے ہیں کہ" اس زمانہ میں کہ میرے خیالات مذہبی محققانہ اصول پر ہیں۔ اس وقت بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر کسی قسم کے شرک یا بدعت کا اطلاق ہو نہیں پاتا۔ بجز ایک عقیدہ کے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ عبادت بدنی یعنی قرآن مجید پڑھکر بخشنے کا یا فاتحہ دیکر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مردے کو پہنچتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ سید احمد خاں پر مذہبی خیالات میں اُن کی والدہ کا کہاں تک اثر ہوگا۔

تیسرا امر جس میں میں نے سید احمد خاں کو خاص طور پر ممتاز خیال کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ سلطنت انگریزی کے نہائیت وفادار اور خیر خواہ تھے۔ اور سب سے پہلا یہ شخص تھا جس نے نہائیت جانفشانی کے ساتھ اس امر کی کوشش کی کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں باہمی عمدہ خیالات اور عمدہ تعلقات پیدا کئے جائیں۔ اور اس میں اُسے بہت بڑی کامیابی ہوئی۔ پچاس سال پہلے اور آجکل کا مقابلہ کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت مسلمان انگریزی سلطنت کے بدخواہ اور انگریزوں کی قوم کے جانی دشمن اور مخالف خیال کئے جاتے تھے۔ اور آج وہی مسلمان ہیں۔ کہ برٹش گورنمنٹ کے خیر خواہ اور اُن کی وفادار رعایا کہلاتے جاتے ہیں۔ اُس وقت مسلمان کی صورت دیکھکر انگریز کی آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا۔ کیونکہ وہ خوب سمجھتا تھا۔ کہ ہماری سلطنت کا سب سے بڑا بدخواہ اور ہماری قوم کے خون کا پیاسا یہی شخص ہے۔ اور یہی شخص ہے جس کے بے رحم ہاتھ نے ہمارے معصوم بچوں اور بے گناہ بی بیوں کا بیدریغ خون بہایا ہے۔ لیکن آج مسلمانوں سے اس کا برتاؤ نہائیت قابل تعریف ہے۔ وہ مسلمانوں کی تعریف میں بڑے بڑے آرٹیکل لکھتا ہے۔ اور انہیں اپنی سلطنت کے قیام کے لئے بڑی تقویت خیال کرتا ہے۔ یہ حیرت انگیز تغیر صرف سید احمد خاں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ جسے اعلا درجہ کی کامیابی سمجھنا چاہیے اور زیادہ تعجب خیز یہ امر ہے کہ یہ سب کچھ بلا کسی غیر کی مدد کے صرف ایک شخص کی سرگرمی اور کوشش کا نتیجہ ہے۔ لیکن انگریزی سلطنت کی خیر خواہی کا خیال سید احمد خاں کو غدر کے بعد پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ شروع ہی سے یہ خیال اُن کے دل میں

تھا۔ اور اس خیال کی پیدا کرنے والی اُنکی والدہ تھیں۔ شاید پڑھکر ناظرین کو تعجب
ہو۔ لیکن فی الحقیقت بات یہی ہے۔ جسے میں مختصر طور پر یہاں ثابت کرنا چاہتا ہوں۔
سرسید کے نانا نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں نے
جب وزارت سے استیعفا دیدیا۔ تو کچھ دنوں بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے
معتمد کو ان کے پاس بھیجا اور تیس ۳۰ ہزار روپیہ سفر خرچ کے لئے پیش کیا۔ اور لاہور
بلایا۔ اُن کے سب دوستوں اور عزیزوں کی کمال خواہش تھی کہ وہ اُسے منظور
فرمالیں۔ اور خود بھی ان کی کسی قدر مرضی تھی۔ لیکن ان کی بڑی بیٹی یعنی سید احمد خاں
بہادر کی والدہ نے کہا۔ کہ "آپ کے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے اور اسقدر کہ
آپ اپنی بقیہ زندگی نہائیت آرام و آسائیش سے بسر کر سکتے ہیں۔ خود لاہور جانا۔
اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے اختیارات ہاتھ میں لینا۔ اور ہم سب
کا انگریزی عملداری میں رہنا خلاف مصلحت معلوم ہوتا ہے۔ نہ معلوم کیا اتفاقات
ہوں۔ اور کیسے ملکی انقلاب در پیش آئیں۔ اور کس قسم کے تکالیف کا سامنا ہو
میں آپ کا انگریزی عملداری کو چھوڑکر وہاں چلا جانا۔ پسند نہیں کرتی۔ دوسرے
آپکا زمانہ ضعیفی ہے۔ اور طبیعت بھی اچھی نہیں رہتی۔ اس لئے یہی مناسب
معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہیں رہیں۔" دبیر الدولہ کے دل پر اس کا اسقدر اثر ہو۔ کہ
اُنہوں نے وہاں جانے سے انکار کردیا۔ اور سفر خرچ واپس بھیجدیا۔ سید
صاحب کی والدہ کے اس مشورے سے یہ بات صاف ظاہر ہے۔ کہ وہ انگریزی
عملداری کی کسقدر قدر کرتی تھیں۔ اور اُسے کسقدر محفوظ خیال کرتی تھیں۔
یہاں تک کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وزارت کو یہاں کے قیام کے مقابلہ میں کچھ نہ سمجھا۔
غدر کے زمانہ میں ایکدفعہ پھر اُن کا خیال انگریزی سلطنت کی نسبت ظاہر
ہوا۔ اور حیرت ہے۔ کہ ہندوستانی عورت کو انگریزوں پر اسقدر بھروسہ ہو۔ جب
دلی میں غدر ہوا تو اُس وقت سید صاحب بجنور میں صدر امین تھے۔ اور باقی اُنکے
خاندان کے سب لوگ دلی میں تھے۔ اُن کی والدہ لوگوں سے کہتی تھیں کہ "انگریز
تھوڑے دنوں میں پھر آجائینگے۔ تم سب خاموش اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے رہو۔
جو لوگ فساد میں شریک نہ ہونگے انگریز اُن کو کچھ نہیں کہینگے۔" ان کو اس بات کا پورا

یقین تھا۔ کہ انگریزوں کی سلطنت جانے والی نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ جو لوگ فساد میں شریک نہیں۔ ان کو انگریز تکلیف نہیں دینگے۔ جب دلّی کے فتح ہونے کا وقت قریب آیا۔ تو سب زن و مرد شہر سے بھاگ کر باہر جا کر پناہ گزیں ہوئے۔ مگر اُنہوں نے (سید صاحب کی والدہ نے) اور اُنکی ایک بہن نے جو نابینا تھیں۔ اسی یقین پر کہ انگریز بے گناہوں کو نہیں ستائینگے۔ اپنے گھر سے قدم باہر نہ رکھا۔ لیکن افسوس اُن کا یہ خیال غلط نکلا۔ اُس تیرہ و تاریک زمانہ میں دوست و دشمن میں تمیز کرنی نہائیت مشکل تھی۔ اور کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ تھا۔ چنانچہ جب دلّی فتح ہوئی۔ تو سپاہی گھروں میں گھس آئے۔ تمام مال و اسباب لوٹ لیا۔ سید کی والدہ اپنی بہن کے اُس کوٹھڑی میں چلی گئیں۔ جس میں لاوارث بڑھیا زیبن رہا کرتی تھی۔ اور آٹھ دس روز بہت تکلیف سے بسر کئے۔ سید صاحب اس مصیبت کی کہانی کو یوں بیان کرتے ہیں۔

اس عرصہ میں میں میرٹھ آ گیا تھا۔ میرٹھ سے دلی پہنچا۔ اور اپنی والدہ کے پاس گیا۔ اس وقت تین دن سے اُن کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ گھوڑے کا دانہ کچھ ملگیا اُسی پر بسر تھی۔ دو دن سے پانی بھی ہو چکا تھا۔ اور پانی کی نہائیت تکلیف تھی۔ میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھٹ کھٹایا اور آواز دی۔ اُنہوں نے دروازہ کھولا۔ پہلا لفظ جو اُنکی زبان سے نکلا یہ تھا۔ کہ "میں! تم یہاں کیوں آ گئے۔ یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں۔ تم چلے جاؤ ہم پر جو گذریگی گذریگی"۔ میں نے کہا کہ یہ آپ خاطرجمع رکھئے۔ مجھے کوئی نہیں مارے گا۔ میرے پاس سب حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں اور دہلی کے گورنر سے ملکر آیا ہوں"۔ انکی طمانیت ہوئی اور معلوم ہوا۔ کہ دو دن سے مطلق پانی نہیں پیا ہے۔ میں پانی کی تلاش کو نکلا۔ پانی اُس طرف کہیں نہیں ملا کنوؤں پر کوئی ایسی چیز نہ تھی۔ جس سے پانی نکالا جا سکے۔ ناچار پھر قلعہ میں گیا۔ اور وہاں سے ایک صراحی پانی کی لیکر چلا۔ جب اپنے گھر کے قریب کے بازار میں پہنچا تو دیکھا کہ وہی لاوارث بڑھیا۔ سڑک پر بیٹھی ہے اور اُس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آبخورہ ہے۔ اور کسیقدر بدحواس ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی پانی کی تلاش کو نکلی تھی۔ تھوڑی دُور چلکر بیٹھ گئی۔ اور پھر اُٹھا نہ

گیا۔ مجھکو معلوم تھا۔ کہ وہ بھی پیاسی ہے۔ دو دن سے پانی نہیں ملا۔ میں نے اس کے آبخورہ میں پانی دیا۔ اور کہا پانی پی لے۔ اس نے کپ کپاتے ہاتھوں سے آبخورہ کا پانی صراحی میں ڈالا۔ اور کچھ گرادیا۔ اور گھر کی طرف اشارہ کیا۔ اور کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ "بیگم صاحب پیاسی ہیں۔ اُن کے لئے پانی لیجاؤنگی۔ اور اسی غرض سے پانی صراحی میں ڈالتی تھی" میں نے کہا "میرے پاس پانی بہت ہے۔ میں لے آیا ہوں۔ تو پانی پی لے"۔ پھر آبخورہ میں پانی دیا۔ اُس نے پیا اور لیٹ گئی۔ میں جلدی جلدی گھر کی طرف آیا۔ اور اپنی والدہ اور خالہ کو تھوڑا تھوڑا پانی پینے کو دیا۔ انہوں نے خدا کا شکر کیا۔ اب میں گھر سے نکلا۔ کہ سواری کا بندوبست کرکے انکو میرٹھ لیجاؤں۔ جب اُس مقام پر پہنچا۔ جہاں بڑھیا زمین لیٹی ہوئی تھی تو معلوم ہوا کہ وہ مرچکی ہے۔ سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کئے۔ لیکن کہیں سواری نہ ملی۔ آخرکار حکام قلعہ نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو لیجاتی ہے۔ مجھ کو دیدی جائے۔ میں وہ شکرم لیکر گھر پر آیا۔ اور اپنی والدہ اور خالہ کو اُس میں بیٹھا کر میرٹھ لے آیا۔

اس تکلیف سے میری والدہ کی طبیعت جادۂ اعتدال سے منحرف ہوگئی اور صفرہ کی نہایت شدت ہوگئی۔ جو دوا یا غذا دیجاتی تھی وہ قے میں نکل جاتی تھی۔ کبھی اس مرض میں کچھ تخفیف ہوجاتی اور کبھی شدت ہوجاتی۔ آخرکار اسی مرض میں بمقام میرٹھ انتقال کیا۔ مگر اُن کی نیک نیتی کا یہ نتیجہ تھا کہ انتقال سے چند روز پیشتر ان کی بیٹی اور نواسیاں اور پوتے اور پوتیاں اور بہوئیں جو مختلف مقامات میں چلی گئیں تھیں۔ سب اُنکے پاس جمع ہوگئی تھیں۔ اور انہوں نے سب کو صحیح وسالم اور خیر و عافیت سے دیکھکر نہایت خوشی کی تھی۔

اُنہوں نے انتقال سے ایک روز پہلے صرف دو وصیتیں مجھکو کیں۔ ایک یہ کہ ان کو بغلی قبر میں جو مسنون ہے۔ دفن کیا جائے۔ دوسری یہ بات کہی کہ ان کے ذمہ نہ تو کوئی روزہ قضا کا ہے۔ اور نہ کوئی نماز قضا کی ہے۔ صرف ان ہی دنوں کی نمازیں اگرچہ میں نے پڑھی ہیں۔ لیکن اگر میں زندہ رہتی تو انکی بھی قضا پڑھتی۔ میرے مرنے کے بعد تم اُس قدر نمازوں کا حساب کرکے کفارہ کے گیہوں ساغرمیوں کو دیدینا۔

جب کہ دوسرے دن اُنہوں نے قضا کی تو میں نے اُن کی دونوں وصیتوں کو پورا کیا"۔ اُن کی نصیحتیں نہایت حکیمانہ ہوتی تھیں۔ مثلاً وہ کہتی تھیں کہ "مصیبتیں جو انسانوں پر پڑتی ہیں۔ اُس میں کچھ خدا کی حکمت ہوتی ہے۔ مگر بندے اُس حکمت کو نہیں سمجھ سکتے"۔ اُنہوں نے سید صاحب کو ایک دفعہ نصیحت کی کہ "جہاں جہاں تم جانا لازمی سمجھتے ہو۔ اور ہر حالت میں تم کو وہاں جانا لازمی ہوگا۔ تو تم وہاں کبھی سواری پر جایا کرو۔ اور کبھی پیادہ پا۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اسکو نباہ سکو"۔ اُن کی یہ نصیحت کس قدر پُر حکمت ہے۔ "اگر کسی نے ایک دفعہ تمہارے ساتھ نیکی کی ہو۔ اور پھر برائی کرے۔ یا دو دفعہ نیکی کی ہو اور دو دفعہ برائی کرے تو تم کو آزردہ نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ ایک یا دو دفعہ کی نیکی کرنے والا کیسی ہی برائی کرے اسکی نیکی کے احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

اس مختصر مضمون کے پڑھنے سے کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ سرسید کی والدہ کیسی عالی خیال۔ دانشمند اور نیک طینت بی بی تھیں۔ اور سید صاحب کی لائیف پر ان کی والدہ کا کیا اثر پڑا۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اُس اثر کو کامل طور پر بیان کر کے بتانا۔ میرے خیال میں نہ صرف مشکل ہی ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اور اگر خود سید بھی چاہتے۔ تو اُسے کامل طور پر نہیں بتا سکتے۔ کیونکہ انسان کے دل و دماغ پر مختلف اوقات میں مختلف طور کے اثر ایسے نامعلوم طور پر پڑتے رہتے ہیں۔ کہ انکی اصلیت اور وجہ کا بتانا یعنی یہ معلوم کرنا کہ یہ کہاں سے آئے۔ اور کیونکر آئے نہایت پُر دقت امر ہے۔ اور خصوصاً اوائل عمر میں جب کہ اس قسم کی تحقیق اور تمیز کی طرف بالکل توجہ نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ سمجھنا چاہئے۔ کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے۔ اس سے بہت زیادہ بلکہ بے انتہا زیادہ اثر سید صاحب کی لائیف پر اُن کی والدہ کا پڑا۔ کیا کچھ کم حیرت کی بات ہے۔ کہ ہمارے زمانہ کا بڑا ریفارمر اور لیڈر عالی دماغ مصنف۔ اعلےٰ درجہ کا پولیٹیشن۔ ایک سچا روشن خیال۔ بڑا مخلص قوم اور ملک اور سلطنت کا ہمدرد اور بہی خواہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اپنی ماں کا سچا شاگرد تھا۔ (اور کیسی ماں جسکو کشمیر کی خاک پاک سے نسبت تھی۔ جو ذکاوت و ذہانت اور روشن خیالیوں

کا مخزن ہے)

وہ لوگ جو تعلیم نسواں کے مخالف ہیں وہ اگر ذرا غور سے دیکھیں تو انہیں معلوم ہوگا۔ کہ اُن کے بہت سے خیالات بہت سے عادات بہت سے توہمات اور تعصبات بہت سے جھوٹ موٹ کے ڈر اور جھوٹ موٹ کی امیدیں جو اُن کے دلوں میں پتھر کی لکیر ہوگئی ہیں۔ انہوں نے اپنی ماؤں سے اخذ کی ہیں۔ اب اگرچہ وہ ان میں سے بہت سے خیالات کو غلط اور فضول تصور کرتے ہیں۔ لیکن افسوس دل سے نہیں مٹا سکتے یہ سبق اُنہوں نے اپنی ماؤں کے گھٹنوں پر بیٹھکر سیکھے ہیں اس وقت جب کہ ان میں برے بھلے کی مطلق تمیز نہ تھی۔ اور ان کے ننھے ننھے دلوں نے ایسی ایسی باتوں کو اخذ کرلیا جن میں دیکھکر آج وہ پچتاتے ہیں جو لوگ کہ ملک کی ترقی کے خواہاں ہیں انہیں! بلکہ جو لوگ صرف اپنی اولاد اور خاندان کی بہبودی چاہتے ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ وہ سب سے پہلے تعلیم نسواں کی طرف توجہ کریں۔ کیونکہ جب تک ہمارے ہاں کی عورتیں لکھی پڑھی اور قابل نہ ہونگی ہماری اولاد کے دل و دماغ پر کوئی عمدہ اثر نہیں پڑ سکتا۔ اور جب آج ہمیں اُنکی عصمت اور غربت پر ناز ہے۔ ایک روز ان کی لیاقت اور عالی دماغی پر بھی فخر حاصل ہوگا۔

(مولوی عبدالحق صاحب بی اے حیدرآباد دکن)

تمام شد

ناول شہنشاہ اکبر

تاریخی اور اخلاقی خیالات کی یہ کتاب درحقیقت برائے نام ناول ہے۔ صرف ناول کے پیرایہ میں ہندستان کے مشہور ولعزیز شہنشاہ اکبر اعظم کی سلطنت اُسکے دربار اور اراکین دربار کے حالات بیان کرنیکے علاوہ مسیحی مشنریوں کی چالبازیوں شہزادہ سلیم کی زمانہ شہزادگی کی بے اعتدالیوں اور باپ سے بغاوتوں کی کیفیت اس دلچسپ پیرایہ میں بیان کیگئی ہے کہ بغیر ختم کئے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ ایک کشمیری رئیس زادی کی پاک محبت درمیان میں رکاوٹیں کشمیری نوجوانوں کی گناہ سے توبہ اور آخر میں دونوں کی کامیابی۔ اکبر اور پادری کا دلچسپ مذہبی اور پولیٹکل مباحثہ عبدالقادر بدایونی کا اکبر سے آزادانہ طور پر گفتگو کرنا اکبر کے دین الٰہی کا حال کشمیر پر حملہ کرنے کے منصوبے خفیہ پولیس کے کارنامے اکبر اور سلیم کی عبرت انگیز گفتگو اور آخر میں سلیم کا معافی مانگنا۔ کشمیری لیڈی کا اپنے باپ سے بہادرانہ لیکن حیرت انگیز مکالمہ ابوالفضل اور دیگر اراکین سلطنت کی موت اکبر کی پریشانیاں آخر میں اکبر کی حکومت پر آزادانہ رائے زنی غرض یہ ناول دلچسپ تاریخی واقعات کا دلفریب مجموعہ ہے حجم پونے دو سو صفحے

پیسہ اخبار کی رائے۔ اس اخلاقی اور تاریخی ناول پر ہفتہ وار پیسہ اخبار اپنے ۱۴ اگست سنہ رواں کے پرچے میں لکھتا ہے "یہ تاریخی ناول مسٹر محمد الدین فوق ایڈیٹر کشمیری میگزین لاہور نے بہت سی تاریخی کتابوں کے ذریعہ سے تیار کیا ہے۔ یہ ناول معمولی ناولوں کی طرح نہیں بلکہ دلچسپ ہونیکے علاوہ اس سے بہت سے اخلاقی سبق حاصل ہو سکتے ہیں۔ قیمت عہ دفتر کشمیری میگزین لاہور سے خرید و

ایک ناولسٹ کی رائے منشی عبدالغفور صاحب مینجر ڈپوٹی شاپ علیگڈھ مصنف ناول تماشاگاہ عالم وغیرہ لکھتے ہیں "کہ عرصہ دراز کے بعد ایک دلچسپ اور قابل دید ناول نظر سے گذرا جہانتک واقعات کا تعلق ہے۔ آپ کا مولفہ نہائیت دلکش اور عالمانہ ہے۔ ترجمہ نہائیت صحیح اور بامحاورہ ہے اور جہانتک آپ نے تصرف سے کام لیا ہے۔ وہ بھی قابل داد وصاد ہے۔ آپکا ناول زبان اردو میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ اور میں آپکی محنت کا دل سے معترف ہوں"

المشتہر مینجر کشمیری میگزین لاہور

تیمارداری یا زچہ خانہ

طب کی ایک نادر اور لاجواب کتاب

یہ کتاب کیا ہے بتیس سال کے تجربہ کا نچوڑ ہے۔ اور کس کی تصنیف ہے۔ رائے بہادر ڈاکٹر برج لعل گھوش آنریری اسسٹنٹ سرجن گورنمنٹ والیسرائے و لیکچرار و سپرنٹنڈنٹ جماعت ہندوستانی میڈیکل کالج کی ہندوستانی مریضوں بالخصوص عورتوں اور بچوں سے متعلق اس قدر ہدایات اس میں درج ہیں کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو کبھی بیمار ہونے کی نوبت ہی نہ آئے۔ ہر ایک کنبے اور عیالدار گھر میں اس کتاب کی ایک ایک جلد ضرور رہنی چاہیئے۔ فہرست مضامین پورے دس صفحوں پر ہے۔ حجم تصویروں کے علاوہ ۔۔۔ صفحہ کاغذ اور لکھائی چھپائی نہایت اعلےٰ۔ قیمت عیسم معہ محصول۔ چونکہ بک عیسم اس کتاب کی ہوگی اسی سے ظاہر ہے کہ لیڈی ۔۔۔ سابق لاٹ صاحب پنجاب کی خاتون محترمہ) کی خاص اجازت سے ان کی نذر کیگئی تھی۔ بہت تھوڑی جلدیں ہیں جلدی منگوا لیجئے

المشتہر

منیجر پبلک ایجنسی اندرون دہلی دروازہ لاہور

مکمل تاریخ کشمیر

بسنسکرت کی مشہور تاریخ راج ترنگنی کا نچوڑ

حصہ اول جسمیں راجگان کشمیر کے کئی مختلف خاندانوں کے قریباً ایک سو ساٹھ جلیل القدر راجاؤں کے مکمل و صحیح حالات سنسکرت فارسی۔ اردو۔ انگریزی کی مطبوعہ اور قلمی تحریروں اور بہت سی قلمی تاریخوں کے مطالعہ کے بعد درج کیے گئے ہیں۔ بعض ایسے حالات بھی ہیں جو کسی تاریخ میں بھی نہیں ملیں۔ اور بڑی تلاش سے دستیاب ہوئے ہیں۔ اسی ضمن میں ہندوستان کی قدیم تاریخ قدیم تہذیب اور قدیم طرز معاشرت و حکومت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت عیسم حجم مع نقشہ جات ۴۹۰ صفحہ۔

حصہ دوم جسمیں سلاطین کشمیر کے پانچسو سالہ پرشوکت عہد حکومت کو وضاحت سے قلمبند کیا گیا ہے خصوصاً سلطان زین العابدین کے حالات نہایت وضاحت سے لکھے گئے ہیں جس کے نقش قدم پر چلکر اکبر نے ہر دلعزیزی حاصل کی تھی سلطان زین العابدین کو کشمیر میں بڈشاہ یعنی شہنشاہ معظم کہتے ہیں اور ہندو و مسلمان اس کے نام کی عزت کرتے ہیں صفحہ ۳۰۰ کاغذ ولایتی کتاب مجلد قیمت عیسم۔ ہر دو حصہ لینے خریدار کو خرچ ڈاک معاف۔ تاریخ کے دونوں حصوں میں یہ بات خصوصیت سے ظاہر کی گئی ہے کہ قومیں اور سلطنتیں کس طرح بنتی اور بگڑتی ہیں۔ }

المشتہر منیجر کشمیری میگزین لاہور

ہندو کلاسیکل ڈکشنری

ہندی الفاظ اور ہندوؤں کے مشہور مقامات اور مشہور دیوتاؤں کی شرح اور کیفیت اس فن میں آج تک کوئی کتاب نہیں چھپی تھی اور اسکی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی حجم قریباً ۳۰۰ صفحہ قیمت تین روپے۔ ہر ہندو گھر میں ہندو کلاسیکل ڈکشنری کی ایک ایک جلد رہنی چاہیئے۔

المشتہر منیجر پبلک ایجنسی اندرون دہلی دروازہ لاہور

تیس برس کا سرمایہ

یعنی بڑے بڑے کامل شناسا بوٹیوں کے جاننے والوں اور حاذق حکیموں کے عجیب وغریب مجربات کا مجموعہ اور نسخہ جات نادر الوجود اور اسرار سینہ بسینہ کا خزینہ اس کے مصنف پنجاب کے ایک مشہور رئیس خاندان کے جلیل القدر ممبر ہیں جنہوں نے اپنی ذاتی کوششوں سے کمزوری ناطاقتی جریان جوانمردی۔ آتشک اور سوزاک وغیرہ امراض کے نسخے تیس برس تک ملک بملک اور جنگلوں اور پہاڑوں میں پھر کر حد درجہ تجربے امتحان اور آزمائش کے بعد مفصل اور آسان ترکیبوں کے ساتھ قلمبند کئے ہیں۔ تمام بیماریوں اور تمام جڑی بوٹیوں کا اس کتاب میں ذکر ہے۔ ایک ایک مرض کے کئی کئی نسخے ہیں جو نسخہ طبیعت کے موافق ہو۔ اس کو بنالو۔ ایک ایک نسخہ دس دس روپیہ کو سستا پاؤ گے۔ تجربہ کرو اور آزماؤ۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت مع خرچ ڈاک

ایک روپیہ تین آنہ (عہ/۳)

المشتہر منیجر کشمیری میگزین لاہور

شیر افگن گولیاں

غلط کاریوں کی وجہ سے اگر کمزوری حد سے زیادہ ہوگئی ہو۔ پٹھے حافظہ اور اعصاب کمزور ہوں۔ یا جریان احتلام اور سرعت کی شکایت ہو۔ تو یہ گولیاں اکسیر عنبری۔ روح حیات۔ امرت دھارا۔ اور روح جیون بوٹی ثابت ہوں گی مختصر یہ ہے کہ ان کا استعمال بوڑھوں کو جوان اور جوانوں کو پہلوان کر دیتا ہے۔ یاد رکھو اعتقاد اور یقین اور یکسوئی آدھی شفا ہے۔ قیمت فی شیشی (۳۰ گولیاں) تین روپے (عہ)

طلائے دافعہ نامردی و سستی

جلق۔ نامردی اور جریان کا مجرب علاج یہ بے نظیر طلاء ہے۔ جو عضو خاص کی کمزوری۔ کجی۔ سستی۔ لاغری اور ٹیڑھا پن کو دور کرنے کا بہترین خارجی علاج ہے۔ قیمت فی شیشی دو روپے (عہ)

طلاء اور گولیوں کے ترکیب استعمال کا پرچہ دوا کے ہمراہ ارسال ہوگا۔ بجائے لمبے چوڑے سرٹیفکیٹوں کے یہ درج کر دینا زیادہ مناسب ہے۔ کہ ان دواؤں کے موجد کو حضور لفٹنٹ گورنر بہادر صوبہ پنجاب کی طرف سے علاوہ انعام کے اعزازی سند بھی ملی ہوئی ہے۔ مکمل بکس جس میں ایک شیشی گولیاں اور ایک شیشی طلاء ہوگی۔ علاوہ خرچ ڈاک کے پانچ روپے میں ملیگا اور یہ یاد رہے کہ جب تک طاقت رجولیت حاصل کرنے کا داخلی اور خارجی علاج نہ کیا جائے حقیقی صحت دشوار ہے۔

المشتہر:۔ پبلک ایجنسی اندرون دہلی دروازہ لاہور

بلستانی ... آسیز قیمت ... سرکا ... قیمت ... فی درجن ۱۲ / منیجر کشمیری میگزین لاہور

درجہ دوم ... برقی ... کنگھی ... درجہ اول

خوبصورت دانت خلال ... قیمت فی سینکڑہ ...

... ضرورت کی ... نہایت عجیب ...

فہرست تصنیفات ایڈیٹر کشمیری میگزین لاہور

سوانحمریاں، تاریخی کتب و سفرنامے

سوانحمری ایڈورڈ ہفتم مرحوم ... ۶ر
تاریخ سپین کے حالات ... ۴ر
فاتح ملتان ۳ر راجہ بیربر ... ۴ر
حالات راجہ ٹوڈرمل ... ۴ر
حالات نواب دبیرالدولہ ... ۶ر
ملا دو پیازہ ... ۴ر
حیات نورجہاں و جہانگیر ... ۶ر
ماتم پہلوانی یعنی غلام پہلوان مرحوم کی سوانحمری ۲ر
سفرنامہ کشمیر ... ۶ر
حالات مہاراجہ رنجیت سنگھ ۱۲ر
حالات مولانا روم ۲ر حالات شمس تبریز ۸ر
تذکرہ سلطان زین العابدین ... ۶ر
مکمل تاریخ کشمیر حصہ اول عہ حصہ دوم عہ حصہ سوم عہ
مشاہیر کشمیر ... عہ
حالات مہاتما بدھ ... ۶ر
تاریخ ریاستہائے بگھیل کھنڈ معہ تحقیقات طلسم بکاولی ۸ر
تاریخ شالامار باغ لاہور ... ۸ر
آفتاب بگھیل کھنڈ یعنی سرمہاراجہ بنکار سنگھ بہادر والئے ریاست اجے گڈھ کی سوانحمری ۲ر

ناول

عصمت آرا ۸ر ناکام ۱۲ر خانہ بربادی ۱۲ر
مسٹریز آف امرتسر عہ غم نصیب ۱۲ر
انارکلی عہ مہذب ڈاکو ۴ر محروم تمنا عہ
نیم حکیم خطرۂ جان ... عہ
اکبر جدید تاریخی ناول عہ رام کہانی ۷ر

اخلاق و تصوف

تذکرۃ الصالحین۔ اہل اللہ بزرگوں کے حالات ۱۰ر
ناصح مشفق ... ۸ر
امتحان پاس کرنے کا گر ... ۲ر
تحفہ چراغاں ... ۴ر
یادرفتگاں نوترسیم ... ۱۲ر

نظم و شاعری

بہارگلشن مکمل چار حصے ... ۸ر
ایشیائی شاعری کی الوداع ... ار
کلام فوق معہ تصویر مصنف ... ۶ر

زیر طبع کتب

تذکرہ شیخ نورالدین ولی ۸ر حالات شعرائے کشمیر عہ
کشمیری پنڈتوں اور مسلمانوں کی باتیں معہ تمثیل سوم ۸ر
میرے چار سفر ۱۲ر سلطان العارفین حضرت مخدوم صاحب ۸ر